نظامِ ربوبیت کا پیامبر
طلوعِ اسلام
ماہنامہ ——— لاہور

خط و کتابت
ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)
۲۵/بی۔گلبرگ ۲، لاہور ۱۱
پوسٹ کوڈ ——— ۵۴۶۶۰
ٹیلیفون: ۸۷۹۲۴۶

مجلسِ ادارت

مُدیرِ مسئول: محمد لطیف چوہدری
معاون : ثریا عندلیب

ناشر : شیخ عبدالحمید
طابع : خالد منصور نسیم
مطبع : النور پرنٹرز و پبلشرز
۳/۲ فیصل نگر۔ ملتان روڈ۔ لاہور ۲۵
ٹیلیفون ——— ۲۷۵۸۲۶
مقامِ اشاعت: ۲۵/بی۔گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

جلد ۴۳ ——— جون ۱۹۹۰ء ——— شمارہ ۶

بدلِ اشتراک
سالانہ
پاکستان ——— ۶۰ روپے
بیرونی ممالک ——— (بذریعہ سمندری ڈاک) ۱۲۵ روپے
فی پرچہ: -/۵ روپے

فہرست مضامین

۱ لمعات ——— ادارہ ——— ۲
۲ اسلام میں سیاسی پارٹیوں کی اجازت نہیں ——— ادارہ ——— ۸
۳ نورِ مبین ——— ادارہ ——— ۱۵
۴ عورت اور قرآن ——— جمیلہ خاتون، بھارت ——— ۲۴
۵ امتی باعثِ رسوائیِ پیغمبر ہیں ——— محمود الحسن، بوریوالہ ——— ۲۸
۶ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا.... ——— بشیر احمد عابد، سعودی عرب ——— ۴۱
۷ روئداد ——— مقبول محمود فرحت، لندن ——— ۵۱
۸ حقائق و عبر ——— ادارہ ——— ۵۹
۹ قرآنی تعلیم بچوں کے لئے ——— قاسم نوری ——— ۶۴
۱۰ فہرست کتب ——— ٹرسٹ ——— ۶۷
۱۱ QURAN "FAHMI" ——— شمیم انور ——— ۶۹

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

ایک خط ـــــ ایک نوحہ ـــــ بنام ایڈیٹر

ماہنامہ طلوعِ اسلام

مدیرِ محترم ـــــ السلام علیکم!

اللہ آپ کو خوش رکھّے! مجھے آپ سے بہت سے شکوے ہیں. بہت سے گلے ہیں. خدارا میری بات سُن لیں! آپ دانش ور ہیں، صحافی ہیں، قلمکار ہیں، دردمند محبِّ وطن پاکستانی ہیں، آپ نے دنیا و آخرت میں انسانوں کی بہتری اور بھلائی کے لیے بہت کچھ لکھا ہے. بہت کچھ کہا ہے۔ بہت سے مشورے دیئے ہیں، بہت سی تجاویز پیش کی ہیں، مگر مجھے کہنے دیجیے کہ آپ بھی دوسروں کی طرح ایک خیالی دنیا میں بستے ہیں۔ میرا مشاہدہ ہے کہ حق و صداقت کی اس دَور میں کوئی گنجائش نہیں ہو سکتا ہے میرا مشاہدہ غلط ہو۔ مَیں ایک سیدھا سادہ پاکستانی ہوں جو دیکھتا ہوں اسی پر اپنی رائے قائم کر لیتا ہوں۔ میں نے دیکھا ہے کہ کبھی ایک انسان تڑپتا تھا تو آپ (صحافی) بے چین ہو جاتے تھے۔ آپ کے ایوانِ شعور میں زلزلہ آجاتا تھا۔ ضمیر بے چین ہو جاتا تھا اور آپ کا قلم حرکت میں آجاتا تھا، لیکن اب صورتِ حال یہ ہے کہ آپ کے بارہ کروڑ ہم وطن جاں بلب ہیں۔ بلک رہے ہیں ــــ سسک رہے ہیں اور آپ خاموش ہیں۔ مُلک تباہی کی طرف بڑھ رہا ہے، تہذیب منہ موڑ کر رخصت ہو رہی ہے ــــ قدریں پامال ہو رہی ہیں ــــ انسانیت آخری ہچکیاں لے رہی ہے اور آپ نظری مباحث میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ حق و صداقت، دیانت و امانت اور فرض شناسی کی دلوی کب سے سینہ کوبی ہے۔ حکومت اور اپوزیشن کی محاذ آرائی نے قوم کو ذہنی خلجان میں مُبتلا کر رکھا ہے۔ چور اور ڈکیت دندناتے پھر رہے ہیں۔ لیڈرانِ قوم ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی فکر میں ہیں اور مذہبی پیشوائیت مسجدوں میں دم سادھے وعظ و نصیحت پر اکتفا کر رہی ہے۔ عبادات پر زور دینا غیر اہم نہ سہی لیکن کیا صرف یہ دینا کافی ہے کہ نماز پڑھو، روزے رکھو، دعائیں مانگو یا پھر اذانیں دو۔ قومیں جب کسی عذاب میں مبتلا ہو جائیں۔ تباہی و بربادی کا بپھرا ہوا طوفان بڑھتا چلا آرہا ہو تو کیا وہ یہی کچھ کیا کرتی ہیں؟ کیا رسولِ اکرم

اور صحابہ کرامؓ مصیبت و آلام اور جنگ و جدال کے وقت عملی اقدام اٹھانے کی بجائے کچھ ایسے ہی طریقے اختیار کیا کرتے تھے؟ جب کسی گھر پر افتاد پڑتی ہے، قیامت ٹوٹتی ہے، بیماری آتی ہے تو کیا لوگ مداوا نہیں کرتے؟ پھر ہم کس مسیحا کے انتظار میں ہیں؟ پاکستان کی شہ رگ پر دو دھاری تلوار رکھی ہے، ملک کی اخلاقی اور ایمانی سرحدوں پر ڈائنامائیٹ فٹ کئے جا چکے ہیں، قوم کی حس کو اس حد تک مفلوج کیا جا چکا ہے کہ لاشوں کے ڈھیر اور تباہی کے مناظر سے روحیں لطف اندوز ہونے لگی ہیں۔ آگ کے شعلوں میں گھر جانے کے باوجود قوم کھیل تماشوں میں مگن ہے۔ کردار کا جنازہ نکل رہا ہے اور دانش ورانِ قوم نے آنکھوں پر پر پٹی باندھ رکھی ہے۔ اگر ایسا نہیں تو آپ ہی بتائیں۔

۱۔۔۔ کیا نیکی کا بدلہ نیکی ہے؟

۲۔۔۔ کیا سچ واقعی اچھی چیز ہے؟

۳۔۔۔ کیا حق کا بول بالا ہے؟

۴۔۔۔ کیا ایمان ہی سب سے بڑی دولت ہے؟

۵۔۔۔ کیا محنت میں واقعی عظمت ہے؟

۶۔۔۔ کیا رشوت واقعی بُری چیز ہے؟

۷۔۔۔ اور کیا انصاف نام کی کوئی چیز موجود بھی ہے؟

مجھے یقین ہے آپ ان میں سے کوئی بات بھی ثابت نہیں کر پائیں گے۔ اس لئے آپ مان جائیں محترم! کہ آپ کی باتوں میں اب کوئی وزن نہیں ہے اور اگر آپ کو پھر بھی انکار ہے تو سنئے!

۔۔۔ "میری ماں بیمار ہے۔ باپ لاچار ہے۔ تین بہنیں ہیں۔ سب کی امیدیں مجھ سے وابستہ ہیں۔ میں ایم۔ اے پاس ہوں، مجھے روزگار دلا دیں۔ میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں مجھے عزت لے دیں، کسی سے کہیں مجھے خرید لے، میری ڈگریوں سمیت۔ چند سکوں کے ہی عوض۔۔۔ تاکہ میں اپنی بیمار ماں کے آنسو خشک کر سکوں"

محترمہ بے نظیر صاحبہ کو بتائیں، میاں نواز شریف صاحب کو سمجھائیں کہ چند ماہ پہلے ہم نے انہیں ووٹ دیا تھا اور انہوں نے کہا تھا کہ کوئی بے روزگار نہیں رہے گا۔ کوئی بھوکا نہیں سوئے گا۔ ہم عزتِ نفس بحال کر دیں گے۔ انہیں یاد دلائیں ایڈیٹر صاحب! ان کی یادداشت اتنی کمزور تو نہیں ہوگی کہ وہ کل کی بات بھول جائیں۔

انہیں بتائیں کہ لمبی لمبی گاڑیاں اور بڑی بڑی فیکٹریاں انہیں مبارک لیکن خدارا گاڑیوں کے دھوئیں

اور کارخانوں کی زہریلی گیس سے ہمارے پھیپھڑے تو تباہ نہ کریں، خدا کی قسم ہم ہیں نئے پھیپھڑے لگوانے کی سکت نہیں۔

آپ انہیں بتاتے کیوں نہیں ایڈیٹر صاحب کہ آپ کی قوم کی کتنی بیٹیاں ہیں جو گھر بیٹھے بوڑھی ہو رہی ہیں۔ کتنے بیٹے ہیں جن کی صلاحیتیں کُند ہو رہی ہیں، کتنے بوڑھے ہیں جو ایک لمحے کے سکون کے لئے ترس رہے ہیں۔ دوا کے ایک گھونٹ کے لئے، ڈاکٹر کی ادنیٰ سی توجہ کے لئے۔ کتنے انسان ہیں جو ہسپتالوں کے دروازوں پر دم توڑ دیتے ہیں۔ کتنے بچے اغواء ہو جاتے ہیں، کتنی بچیاں بے عصمت ہو جاتی ہے، کوئی گھر سے نکلتا ہے تو پھر لوٹ کر نہیں آتا۔ بدعنوانی اور لاقانونیت سکۂ رائج الوقت کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ قانون پسند شہریوں کو نہ دن کا چین نصیب ہے نہ رات کی نیند۔ حکمران کہتے ہیں کہ لوگ دیانتداری سے ٹیکس ادا نہیں کرتے۔ ان سے پوچھیں کیا ملتا ہے ان لوگوں کو اس ٹیکس کے بدلے میں؟ کوئی پُل عبور کرنا ہو تو پیسے خرچ کرو۔ تازہ ہوا میں سانس لینے کے لئے کسی باغ یا پارک میں، جانا ہو تو ٹکٹ خریدو ـــــ پیاس لگی ہو اور جیب میں پیسے نہ ہوں تو تڑپتے رہو ـــ نہ علاج مفت نہ تعلیم سستی ـــ نہ جان و مال محفوظ نہ عزت و آبرو سلامت ـــــ ٹیکس دیں تو کیوں دیں؟ ٹیکس تو معاوضہ ہے ان سہولتوں کا جو حکومت فراہم کرتی ہے اور اگر یہ سب کچھ پیسے دے کر ہی حاصل کرنا ہے تو پھر :۔

اے سنگدل، تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو!

پیسے دے کر سر تو کہیں بھی پھوڑا جا سکتا ہے!

اور نہیں تو آپ انہیں جہاد کا مشورہ ہی دیں، بڑے میدان ہیں اس کے لئے ۔ برائی کے خلاف جہاد ۔ جہالت کے خلاف جہاد ۔ بے روزگاری کے خلاف جہاد ۔ افلاس کے خلاف جہاد ـــــ مگر نہیں افلاس کے خلاف جہاد کا مشورہ نہ دیجئے گا، اس سے تو ان کا "روٹی، کپڑا اور مکان" کا نعرہ بے اثر ہو جائے گا، پانچ اور سات مرلے کے پلاٹوں کی سکیمیں دھری کی دھری رہ جائیں گی ـــــ نہیں ایڈیٹر صاحب یہ غضب نہ کرنا ۔ اس طرح تو عوام کی خدمت کا کوئی موقع ہی باقی نہیں رہے گا۔ اور لیڈرانِ قوم خدمت نہیں کریں گے تو ووٹ کیسے لیں گے۔

سُنئے! میں بھی ایک انسان ہوں، جو مہنگائی، بے روزگاری اور مفلسی کے ہاتھوں مر رہا ہے۔ میرے اندر کا انسان آپ مار دیں گے تو اس کی جگہ ایک درندہ جنم لے لے گا، میرے بچے کے ہاتھ سے آپ کتاب چھین لیں گے تو اس کے ہاتھ میں کلاشنکوف آ جائے گی؛ مجھ سے آپ میری حیا اور

تہذیب چھین لیں گے تو بے غیرتی کا مرثیہ مجھ پر حاوی ہو جائے گا۔ آپ میرا ایمان لوٹ لیں گے تو میں لوٹ مار اور غارتگری کے گُر سیکھ لونگا، مگر نہیں ابھی میری قوم کے دانشور زندہ ہیں۔
ابھی ہمارے درمیان ایسے صاحبانِ فکر و نظر موجود ہیں جن کے دل میں خوفِ خدا ہے — جن کے سامنے تصورِ آخرت اور فلاحِ ملت ہے۔ آپ صرف اتنا کرم کر دیجئے کہ میری یہ معروضات میرے یہ آنسو اُن تک پہنچا دیجئے، شاید ان آنسوؤں کی قسمت جاگ اُٹھے اور وہ قوم کو اس گرداب سے نکالنے کی کوئی سبیل کر سکیں۔
یہ درست ہے ایڈیٹر صاحب! کہ حکومت اِس وقت بڑے بڑے مسائل سے نبرد آزما ہے۔ مسئلہ افغانستان ہے، مسئلہ کشمیر ہے، مسئلہ بینظیر ہے، مسئلہ نواز شریف ہے۔ لہٰذا مجھ جیسے غریب عوام کے دلوں کی فریاد سننے کیلئے اس کے پاس وقت کہاں ہوگا؟ لیکن اتنا تو پوچھ دیں کہ کسی ایم۔پی۔اے یا ایم۔این۔اے تک رسائی نہ ہو، جیب میں پیسے بھی نہ ہوں، وہ غریب روزگار کیلئے کس کے دروازے پر دستک دے؟
آپ ہی بتائیں ایڈیٹر صاحب! جہاں لوکریاں بکتی ہوں، تبادلے نیلام ہوتے ہوں، پولیس عیدی کے لئے رہزنی اختیار کرتی ہو، انصاف کے لئے کورٹ فیس لگتا ہو، الف آئی آر درج کرانے کے لئے گھر بکتے ہوں، ممبرانِ اسمبلی اور عوامی نمائندوں سے ملنے کے لئے دربانوں کے تلوے چاٹنے پڑتے ہوں وہاں مجھ جیسا غریب کیا کرے؟ کہاں ہے وہ حکمران جو کہتا تھا کہ اگر دجلہ کے کنارے کتا بھی بھوک سے مرگیا تو سربراہِ مملکت سے اس کی باز پرس ہوگی۔ والسلام

(ایک پاکستانی)

سوال یہ ہے کہ "بہ حالاتِ موجودہ" اس تباہی سے بچنے کی صورت کیا ہے؟ ہم نے "بہ حالاتِ موجودہ" کی تخصیص اس لئے کی ہے کہ قوم نے اپنے لئے جو سیاسی روش اختیار کر رکھی ہے۔ یہ خرابیاں اسی کی پیدا کردہ ہیں اور اسی میں اصلاح سے ان خرابیوں کے علاج کی صورت تلاش کرنی ہوگی — ورنہ حقیقی اصلاح تو صرف اس وقت ممکن ہوگی جب قوم میں فکری تبدیلی پیدا ہوگی۔ قوم نے اپنے لئے "مغربی جمہوریت" کو بطور سیاسی روش اختیار کر رکھا ہے، لیکن جمہوریت کا لفظ صرف زبانوں پر ہے۔ دِل سے یہاں کوئی بھی جمہوریت کا خواہاں نہیں۔ جمہوریت کے معنی بتائے جاتے ہیں، قوم کی مرضی کے مطابق حکومت قائم کرنا۔ قوم کی مرضی معلوم کرنے کا طریقہ، الیکشن تجویز کیا جاتا ہے۔ الیکشن میں جو پارٹی اکثریت حاصل کرلیتی

ہے اُس کے متعلق سمجھ لیا جاتا ہے کہ وہ قوم کی مرضی کی نمائندگی کرتی ہے، جو پارٹیاں اقلیت میں رہ جاتی ہیں اگر وہ بہ دل جمہوریت کی قائل ہیں تو انہیں اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیئے کہ اگلے الیکشنوں تک قوم کی مرضی کی نمائندگی اکثریت کی پارٹی کرتی ہے، اقلیت کی پارٹیاں نہیں۔ لیکن ہمارے ہاں ہوتا یہ ہے کہ اِدھر اکثریت کی پارٹی حکومت قائم کرتی ہے، اُدھر اقلیتی پارٹی یا پارٹیاں اس کے خلاف محاذ قائم کر لیتی ہیں۔ اور ہر ممکن کوشش کرتی ہیں یہ ثابت کرنے کے لئے کہ قوم کی مرضی کی نمائندگی اکثریتی پارٹی نہیں کرتی، ہم کرتی ہیں۔ مقصد ان کا یہ ہوتا ہے کہ اگلے الیکشن سے پہلے ہی برسرِاقتدار پارٹی کی حکومت کا خاتمہ کر کے خود مسندِ اقتدار پر قابض ہو جائیں۔ آپ غور کیجئے کہ ان پارٹیوں کی یہ روش خود اس اصولِ جمہوریت کے کس قدر خلاف ہے جسے یہ زبان سے دن رات دہراتی رہتی ہیں۔ نتیجہ اس کا مسلسل خلفشار کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ جن قوموں نے نظامِ جمہوریت کو بہ دل تسلیم کیا ہوتا ہے۔ ان میں اقلیتی پارٹیاں، اکثریتی پارٹی کی حکومت کے غلط اقدامات پر تنقید تو کرتی رہتی ہیں لیکن اپنے آپ کو قوم کی مرضی کی نمائندہ کی حیثیت سے پیش یا مسلط نہیں کرتیں۔ اس مقصد کے لئے وہ آئندہ الیکشن تک کا انتظار کرتی ہیں۔

اب آئیے اکثریتی پارٹی کی طرف۔ وہ الیکشن میں چند نشستیں زائد حاصل کر لینے کے بعد سمجھ لیتی ہے کہ ہم سیاہ کریں یا سفید (کم از کم) آئندہ الیکشن تک حکومت کرنا ہمارا مسلّمہ حق ہے اور قوم ہمارے اس حق کو ہم سے چھین نہیں سکتی۔ اس ذہنیت کے ماتحت وہ اپنی حیثیت قوم کی مرضی کی نمائندہ نہیں سمجھتی، اپنے آپ کو بہرحال قوم پر مسلّط رکھنے کی حقدار سمجھتی ہے۔ اس سے جمہوریت، چنگیزیت میں بدل جاتی ہے۔ اور برسرِاقتدار طبقہ قوم سے اوّلاً بزبانِ حال (اور بعدہٗ بزبانِ قال) کہہ دیتا ہے کہ تم جو جی میں آئے کر لو، ہم (کم از کم آئندہ الیکشن تک) تمہارے سر پر مسلّط رہیں گے۔ اگر تم ہماری بات بطیبِ خاطر نہ مانو گے تو ہم اسے ڈنڈے کے زور سے منوا لیں گے۔ اس کا نام وہ رکھتے ہیں، قانون کے زور پر حکومت کا قیام (GOV.T : ESTABLISHED BY LAW) اور عملاً مطلب اس کا یہ ہوتا ہے کہ تم ہمیں ووٹ دیکر جو حماقت کر بیٹھے ہو، اس کا اب خمیازہ بھگتو۔ نتیجہ اس کا فساد اور خلفشار کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اکثریتی پارٹی یہ کسطرح معلوم کرے کہ اس کے اقدامات کو قوم کی رضامندی حاصل ہے یا نہیں! اگر یہ کہا جائے کہ اس کے جس فیصلہ کے خلاف قوم احتجاج کرے اس کے متعلق سمجھ لیا جائے کہ وہ قوم کی مرضی کے خلاف ہے تو اس میں خطرہ یہ ہے (اور یہ خطرہ آئے دن ہمارے سامنے نمودار ہوتا رہتا ہے) کہ اقلیتی پارٹیاں جب

جی چاہے قوم کو مشتعل کر کے حکومت کے خلاف احتجاج پر آمادہ کر دیں گی۔ یہ ہے مغربی نظام جمہوریت کا بنیادی نقص جو تمام خرابیوں کا ذمہ دار ہے۔ جو قومیں اصول جمہوریت کو دل سے تسلیم کرتی ہیں ان کے ہاں ایسی صورت شاذ و نادر پیدا ہوتی ہے۔ ان کی اکثریتی پارٹی اپنی انگلیاں قوم کی نبض پر رکھتی ہیں اور جونہی محسوس کرلیتی ہے کہ ان کے کسی فیصلہ کا نتیجہ قوم کے مفاد کے خلاف جارہا ہے، وہ اسے خود ہی واپس لے لیتی ہے، اور اگر دیکھے کہ مُلک کا سنبھالنا ان کے بس کی بات نہیں رہا تو مستعفی ہو جاتی ہے پوری پارٹی کا مستعفی ہو جانا تو ایک طرف پارٹی کے افراد کی بھی یہ حالت ہوتی ہے کہ ان میں سے جونہی کوئی دیکھے کہ اس کا کوئی کام مُلک کے خلاف اٹھ گیا ہے، وہ اپنا استعفیٰ پیش کر دیتا ہے ——— ہمارے ہاں اس ذہنیت تک پہنچنے کے لئے نہ معلوم ابھی کتنی مدت درکار ہوگی۔ یہاں تو ہر شخص کو کرسی حاصل کرنے کی ہوس اور حاصل کر لینے کے بعد اس کے ساتھ چپکے رہنے کی کوشش، اصول و اقدار کی طرف سے اندھا کر دیتی ہے۔ جہاں تک جمہوریت کے عملی تجربہ کا تعلق ہے۔ اس کی زندہ مثال ہمارے سامنے ہے۔ مُلک اس وقت جس تذبذب اور اضطراب کے نرغے میں ہے اس کے تصور ہی سے رُوح کانپ اٹھتی ہے۔ بجیرو جیپ پر سوار، کلاشنکوف برداروں کے جلو میں دکھائی دینے والے کسی شخص کے متعلق تحقیق کی ضرورت نہیں وہ یقیناً ہمارا قومی لیڈر یا کوئی معلّمِ اخلاق ہوگا۔ جس مُلک میں امن و امان اور باہمی اعتماد کی فضا ایسی ہو کہ ایک عام آدمی تو درکنار ایک بزعمِ خویش ہردلعزیز قومی لیڈر اور مذہبی پیشوا بھی اپنے تحفظ کے لئے اپنی "نجی فوج" رکھنے پر مجبور ہو اس مُلک میں انگلستان اور امریکہ کے جمہوری قالب (DEMOCRATIC PATTERN) کی باتیں کرنا خود فریبی اور حقائق فراموشی نہیں تو اور کیا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ مروّجہ جمہوری مشینری کے ناکام تجربے کے بعد مُلک کے سیاستدان، اور اربابِ دانش و بینش سر جوڑ کر بیٹھیں اور موجودہ جمہوری ڈھانچے میں ایسی زُود اثر تبدیلیاں عمل میں لائیں جن سے قومی نمائندگان خود بھی سُکھ کی نیند سو سکیں اور عوام کو بھی چین نصیب ہو۔

ہمارے نزدیک جب تک مغربی جمہوریت کو مشرف بہ اسلام نہیں کیا جاتا اسی قسم کا جمہوری تماشا جاری رہے گا اور ابھی تو ابتدا ہے ؎

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

مجلہ طلوعِ اسلام اپریل ۱۹۴۸ء
سے ماخوذ

اسلام میں پارٹیوں کی اجازت نہیں

قرآن کریم خدا کی کتاب ہے جو نبی آخرالزماں، صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن توسط سے نوعِ انسان کی ابدی ہدایت کے لیئے دنیا کو ملی ہے۔ جو لوگ اس پر ایمان رکھتے ہیں، اس کے ارشادات ان کے لیئے دین میں آخری سند اور حجت کا درجہ رکھتے ہیں۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ امتِ مسلمہ میں سیاسی پارٹیوں یا مذہبی فرقوں کی اجازت ہے یا نہیں۔ قرآن کریم کا فیصلہ کیا ہے، ہم اس باب میں لمبی چوڑی بحث کے بجائے، قرآنِ کریم کی متعلقہ آیات پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔ انہیں بغور مطالعہ فرمائیے!

۱۔ سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ قرآن کریم نے اصولی طور پر، تمام نوعِ انسان کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ اور اس تفریق و تقسیم کا معیار، کفر اور اسلام ہے۔ ارشاد ہے!

هُوَ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ (۶۴/۲)

"اللہ وہ ہے جس نے تمہیں (نوعِ انسان کو) پیدا کیا۔ سو تم میں سے ایک گروہ کفار کا ہے اور دوسرا گروہ مومنین کا۔"

یہاں دیکھئے تمام کے تمام مومنین کو ایک گروہ قرار دیا گیا ہے جس میں کسی قسم کی تفریق و تقسیم کا شائبہ تک نہیں۔

۲۔ جو لوگ رسالتِ محمدیہؐ پر ایمان لا کر حلقۂ مومنین میں داخل ہوئے انہیں قرآنِ کریم نے ایک امت قرار دیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (۲/۱۴۳)

اور اس طرح کیا ہم نے تم کو امتِ معتدل تاکہ ہو تم گواہ لوگوں پر اور ہو رسول تم پر گواہی دینے والا۔
(ترجمہ شیخ الہند)

اس آیۂ جلیلہ میں دیکھئے!

(۱) جَعَلْنٰكُمْ۔ جعلنا سے واضح ہے کہ خدا نے مومنین کو ایسا بنایا ہے اور کُمْ کی ضمیر جمع مخاطب سے ظاہر ہے کہ اس میں تمام کے تمام مومنین شامل ہیں۔ ان سب کو خدا نے کیا بنایا ہے؟ اُمَّةً

ایک امّت !

(ب) جتنے انسان (النّاس) اس امّت سے باہر ہیں ان سب پر اس امّت کو گواہ بنایا گیا ہے۔

(ج) اور الرّسول، اس پوری کی پوری امّت پر (عَلَيْكُمْ) شہید ہے۔

ایک رسول۔ اور اس پر ایمان لانے والی ایک امّت۔

۳۔ اس امّت کے متعلق سورۂ آلِ عمران میں ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ... (۳/۱۱۰)

تم ہو بہتر سب امتوں میں سے جو بھیجی گئیں عالم میں۔ (ترجمہ شیخ الہند)

كُنْتُمْ۔ تمام کے تمام مومنین کے لئے ہے۔ یہ سب مؤمن مل کر خَيْرَ أُمَّةٍ بنتے ہیں۔

۴۔ اس امّت سے تاکید کی گئی ہے کہ:

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا. وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا. كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ. (۳/۱۰۳)

تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو اور باہمی تفرقہ مت پیدا کرو۔ تم اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ پھر اس نے تمہارے دلوں میں باہمی الفت ڈال دی اور اس طرح تم اس کے فضل سے بھائی بھائی بن گئے۔ تم (اس سے پہلے) آگ کے گڑھے کے کنارے پر پہنچ چکے تھے۔ اللہ نے تمہیں اس سے بچا لیا۔ اللہ اس طرح اپنی آیات کی تمہارے لئے وضاحت کرتا ہے۔ تاکہ تم راہِ ہدایت پر رہو۔

اس آیت سے حسب ذیل نتائج سامنے آتے ہیں۔

(ا) اعتصام بحبل اللہ (یعنی کتاب اللہ کو تھامنے) کی تاکید تمام امّت کو ہے (جَمِيعًا کا لفظ اس کی وضاحت کرتا ہے)

(ب) لا تفرقوا ___ آپس میں تفرقہ مت پیدا کرو، ظاہر ہے کہ فرقوں اور پارٹیوں میں بٹ جانے سے بڑھ کر تفرقہ کیا ہو سکتا ہے؟

(ج) تفرقہ سے باہمی عداوت پیدا ہوتی ہے جو عذاب النّار (جہنّم) میں لے جانے کا موجب ہے۔

(د) اس تفرقہ سے بچا کر انہیں امّتِ واحدہ بنا دینا خدا کی نعمت ہے۔

(س) یہ امت، افرادِ مومنین کے دلوں میں باہمی الفت سے متشکّل ہوتی ہے۔
(ص) اس طرح یہ افرادِ امت، ایک دوسرے کے بھائی بن جاتے ہیں۔
یعنی ـــــ تفرقہ کی جگہ جمعیت۔ عداوت کی جگہ الفت۔ انفرادیت کی جگہ اجتماعیت اور رسمی تعلقات کے بجائے اخوت۔ یہ ہیں اس امت کی خصوصیات۔ اسے دوسری جگہ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ (۶۱/۴) سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ یعنی سیسہ پلائی ہوئی دیوار

۵ مندرجہ آیت کے بعد دوسری آیت میں کہا گیا ہے :-

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ـــــ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ ـــــ وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ۔ (۳/۱۰۵-۱۰۷)

(اے مسلمانو! دیکھنا) ان واضح احکام کے آجانے کے بعد تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو فرقوں میں بٹ گئے اور باہمی اختلافات کرنے لگ گئے۔ یہ لوگ عذابِ عظیم میں مبتلا ہوں گے ـــــ جس دن بعض چہرے سفید ہوں گے اور بعض سیاہ، جن لوگوں کے چہرے سیاہ ہونگے، ان سے کہا جائے گا کہ (یہ اس لئے ہوا کہ) تم لوگوں نے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کر لیا، لہٰذا تم اپنے کفر کی وجہ سے عذاب کا مزہ چکھو ـــــ اور جن لوگوں کے چہرے سفید ہوں گے ان پر خدا کی رحمت ہوگی۔ اور وہ اس حالت میں ہمیشہ رہیں گے۔

ان آیات سے واضح ہے کہ :

(ا) فرقہ بندی اور باہمی اختلاف خدا کے عذاب کا موجب ہیں۔
(ب) یہ ایمان کے بعد کفر اختیار کر لینے کے مرادف ہے۔ اور رُوسیاہی کا باعث۔
(ج) اختلاف اور تفرقہ نہ پیدا کرنے والے رحمتِ خداوندی کے مستحق ہیں۔

۶ سورۂ شوریٰ میں ہے کہ انبیاءِ کرام کو جو دین دیا جاتا تھا اس میں تاکید کی جاتی تھی کہ: أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ (۴۲/۱۳) "وہ دین کو قائم کریں اور اس میں تفرقہ پیدا نہ کریں" لیکن :- كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ (۴۲/۱۳) "ان کی یہ دعوت کہ تفرقہ چھوڑ کر دین کی بنیادوں پر ایک امت بن جائیں، مشرکین کو بڑی ناگوار گذرتی تھی" وہ بہرحال اپنے متبعین کو اس

ہوت کی بناء پر ایک " امّتِ واحدہ" بناکر چلے جاتے تھے۔ وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ (۴۲/۱۴) لیکن ان کے جانے کے بعد وہ باہمی ضد اور تعصب کی بناء پر تفرقہ پیدا کر لیتے تھے حالانکہ اَلْعِلْمُ (وحیٔ خداوندی) ان کے پاس ہوتا تھا۔

اس سے واضح ہے کہ :۔

(ا) دین کی بنیادوں پر وحدتِ امّت، وحیٔ خداوندی کی بنیادی تعلیم تھی۔

(ب) مشرکین پر اس قسم کی وحدت بڑی گراں گزرتی تھی۔ (تفصیل اس کی ذرا آگے چل کر ـــــ زیرِ آیت (۳۰/۳۱) سامنے آئے گی)

(ج) رسولوں کے چلے جانے کے بعد، انکی امّت وحی کی تعلیم کے علی الرغم فرقوں میں بٹ جاتی تھی اور اس کی وجہ مذہبی پیشواؤں کی ضد اور تعصب تھا۔

۷۔ حضورؐ نے (بزبانِ وحی) اپنی امّت سے تاکید کر دی تھی۔

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِىْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۚ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۶/۱۵۳)

" (اچھی طرح دیکھ اور سمجھ لو) یہ ہے میرا سیدھا اور صاف راستہ، سو تم اس راستے کا اتّباع کرو۔ دوسرے راستوں کا اتّباع مت کرو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو وہ راستے تمہیں خدا کی طرف جانے والے راستے سے بھٹکا دیں گے۔ خدا نے تمہیں یہ حکم اس لئے دیا ہے کہ تم تقویٰ شعار رہو۔"

اس سے واضح ہے کہ :۔

(ا) خدا کی طرف لے جانے والا راستہ ایک ہی ہے۔ اسی پر حضورؐ گامزن تھے۔ اور اسی پہ چلنے کی تاکید امّت سے کی گئی تھی۔ فرقہ بندی میں ہر فرقہ الگ الگ راستہ اختیار کر لیتا ہے اور اس طرح خدا کی طرف لے جانے والا راستہ نگاہوں سے گم ہو جاتا ہے۔

(ب) صراطِ مستقیم، جس پر چلنے کی ہر نماز میں دعا مانگی جاتی ہے، ایک ہی ہے۔ متفرق راستوں میں سے کوئی بھی صراطِ مستقیم نہیں ہوسکتا۔

۸۔ ان تصریحات کے بعد، سورۂ روم میں جامع طور پر فرمایا:

وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ـــ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا

شِيَعًا . كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (۳۰/۳۱-۳۲)

(اے جماعتِ مومنین! تم مومن ہونے کے بعد) شرک کرنے والوں میں سے نہ ہو جانا۔
یعنی ان میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے تفرقہ ڈالا اپنے دین میں اور ہو گئے ان میں بہت فرقے۔ ہر فرقہ، جو اس کے پاس ہے اس پر غش ہے۔ (ترجمہ شیخ الہند)

اِس جامع آیت سے واضح ہے کہ:

(ا) دین میں تفرقہ پیدا کرنا مشرکین کا شیوا ہے۔

(ب) تفرقہ کے معنی ہیں فرقہ بندی

(ج) یہ امر مسلّمہ ہے کہ اسلام میں "مذہب اور سیاست" میں ثنویت نہیں۔ لہٰذا دین میں تفرقہ کے اندر مذہبی فرقے اور سیاسی جماعتیں دونوں آجاتی ہیں (فَرَّقُوا دِينَهُمْ . كَانُوا شِيَعًا اور كُلُّ حِزْبٍ کے الفاظ اس کی وضاحت کرتے ہیں)۔ قرآن کریم نے فرعون کے خلاف جو سنگین ترین جرم عاید کیا ہے وہ یہ ہے کہ:۔ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ (۲۸/۴) " وہ مملکت کے باشندوں (بنی اسرائیل) کو پارٹیوں میں تقسیم کرتا رہتا تھا۔ کبھی ایک پارٹی کو کمزور کر دیتا تھا، کبھی دوسری پارٹی کو " لہٰذا پارٹی سازی حکمتِ فرعونی ہے جس کی جڑ کاٹنے کے لئے، صاحبِ ضربِ کلیم، حضرت موسیٰؑ کو اس کی طرف بھیجا گیا تھا۔

۹۔ یہ سب کچھ کہہ دینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرمؐ سے فرمایا کہ:۔

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوا دِيْنَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ . (۶/۱۵۹)

" جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر لیا اور پارٹیوں میں بٹ گئے۔ اے رسولؐ تیرا ان سے کوئی سروکار نہیں "

بات صاف ہو گئی کہ دین میں تفرقہ پیدا کر کے پارٹیوں اور فرقوں میں بٹ جانے والوں کے ساتھ رسول اللہؐ کو کوئی واسطہ نہیں رہتا۔ مسلمان، رسول اللہ کی نسبت سے، امتِ محمدیہؐ بنتے ہیں۔ جن لوگوں کے ساتھ رسول اللہؐ کا واسطہ نہ رہے، ظاہر ہے کہ وہ امتِ محمدیہؐ کے دائرے سے خارج ہو جاتے ہیں۔

۱۰۔ خدا نے کہا ہے۔ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۔ (۲۲/۷۸) خدا نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے۔ فرقوں میں کوئی شخص صرف مسلم (یا مسلمان) کی نسبت سے متعارف نہیں ہوتا۔ وہ اپنے فرقے کے تخصیصی نام سے پہچانا جاتا ہے۔

۱۱۔ خدا نے جماعتِ مومنین کو حزب اللہ کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی خدا کی پارٹی، اور غیر مسلموں کو حزب الشیطٰن، یعنی شیطان کی پارٹی (۵۸/۲۲-۱۹) لہٰذا قرآن کی رُو سے پارٹیاں ـــــ دو ہی ہو سکتی ہیں۔ حزب اللہ یا حزب الشیطان۔ لہٰذا اسلام میں حزب کے بجائے احزاب (پارٹیوں) کا تصور ہی باطل ہے۔

قرآنِ کریم سے تفرقہ (مذہبی فرقہ بندی ہو یا سیاسی پارٹی بازی) کے خلاف اور بھی متعدد شواہد پیش کئے جا سکتے ہیں لیکن ہم انہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم کی ان نصوصِ صریحہ کی روشنی میں دیکھئے کہ کیا اسلام میں مذہبی فرقوں یا سیاسی پارٹیوں کے جواز کا شائبہ تک بھی ملتا ہے؟ جس تفرقہ کو قرآن کفر اور شرک قرار دیتا ہے، کیا وہ اسے کسی صورت میں بھی جائز قرار دے سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ عہدِ رسالت مآبؐ اور دَورِ خلافتِ راشدہ میں آپ کو کسی مذہبی فرقہ کا نام و نشاں ملتا ہے نہ سیاسی پارٹی کا۔ کیا آپ نے کبھی سنا ہے کہ (جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے) حضرت ابوبکرؓ اپنے مقتدیوں کے ساتھ الگ جماعت کرا رہے ہوں اور حضرت عمرؓ الگ۔ کیا آپ کو کہیں بھی یہ لکھا ملتا ہے کہ صحابہ کے مختلف گروہ مختلف فقہوں کے پابند تھے یا کیا آپ کو اس عہد کی پارلیمان (مجلسِ مشاورت) میں اس قسم کا منظر دکھائی دیتا ہے کہ حزبِ اقتدار، خلیفۃ المسلمین کے زیرِ قیادت ایک طرف ہو اور ان کے بالمقابل کسی دوسرے صحابیؓ کے زیرِ قیادت، حزبِ مخالف، دوسری طرف۔ اور تو اور کیا حضرت سعدؓ نے انتخاب میں حضرت ابوبکرؓ سے "شکست کھا کر" کوئی الگ پارٹی بنا لی تھی؟ وہ حضرات (رضی اللہ عنہم) فرقہ بندی اور پارٹی سازی کے خلاف احکاماتِ خداوندی سے واقف تھے، اس لئے وہ جماعت میں تفرقہ کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ قرآنِ کریم نے جو محمد الرسول اللہ والذین معہٗ (۴۸/۲۹) کہا ہے تو والذین معہٗ (حضورؐ کے رفقاء) میں تمام کے تمام مومنین شامل تھے اور رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ (۴۸/۲۹) ان کی خصوصیتِ کبرٰی تھی۔ یعنی ایک دوسرے کے انتہائی غمخوار اور غمگسار۔ کیا ایسی جماعت میں تفرقہ کا شائبہ تک بھی پیدا ہو سکتا ہے؟ حضورؐ کے زمانے میں منافقین نے امت میں تفرقہ پیدا کرنے کی ایک سازش کی تھی؟ سازش کی شکل کیا تھی؟ وہی جو مذہبی پیر ان میں ہوتی ہے۔ یعنی انہوں نے ایک مسجد تعمیر کی تھی۔ آپ سوچئے کہ کیا مسجد کی تعمیر بھی سازش اور جرم قرار پا سکتی ہے؟ لیکن وہ ایسی تخریبی سازش تھی کہ قرآنِ کریم نے اس واقعہ کو اپنے دامن میں محفوظ کر کے، اسے امتِ مسلمہ کے لئے قیامت تک کے لئے آیۂ عبرت قرار دیا ہے۔ سنیئے کہ قرآنِ کریم اس واقعہ کا ذکر کن الفاظ میں کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ:

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ
اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ۔ (۹/۱۰۷)

"ذرا سوچو کہ اِن لوگوں نے کتنی گہری چال چلی ہے۔ انہوں نے ایک مسجد تعمیر کر ڈالی ہے تاکہ یہ ظاہر کیا جائے کہ یہ اسلام کے بڑے خدمتگار ہیں۔ لیکن اس سے درحقیقت ان کا مقصد یہ ہے کہ اس نظام کو نقصان پہنچایا جائے اور کفر کی راہیں کشادہ کی جائیں۔ یعنی مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کیا جائے یہ مسجد نہیں۔ یہ ان لوگوں کے لئے کمین گاہ ہے جو خدا اور رسول کے خلاف مصروفِ پیکار ہیں۔"

غور کیجئے کہ (اور تو اور) جو مسجد بھی مسلمانوں میں تفرقہ کا موجب بن جائے اس کے متعلق خدا کا کیا فیصلہ ہے۔ وہ اسے کفر قرار دیتا ہے۔ وہ اسے خدا اور اس کے رسولؐ کے دشمنوں کے لئے کمین گاہ کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:- وَلَيَحْلِفُنَّ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا الْحُسْنَىٰ ۖ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ (۹/۱۰۷)۔ یہ لوگ قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہم نے اس مسجد کو بڑی حسنِ نیت سے تعمیر کیا ہے۔ لیکن خدا اس کی شہادت دیتا ہے کہ یہ لوگ بڑے جھوٹے ہیں۔

چنانچہ اس کے بعد حضور سے فرمایا گیا کہ: لَا تَقُمْ فِيهِ أَبَدًا (۹/۱۰۸) "اے رسولؐ تم اس مسجد میں قدم تک نہ رکھنا"۔ اور تاریخ میں ہے کہ حضورؐ نے صحابہؓ کو حکم دے کر اس مسجد کو منہدم کر کے خاک سیاہ کر دیا۔ اس سے اگلی دو آیتوں میں اس کی مزید تشریح ہے کہ امتِ مسلمہ میں تفرقہ پیدا کرنے والے کس طرح جہنم کی آگ میں جلتے ہیں۔

پاکستانی مٹکے

بچپن میں ایک واعظانہ قصہ سنا کرتے تھے کہ جب حضرت نوحؑ اپنے متبعین کو ساتھ لیکر کشتی میں سوار ہو گئے اور کفار سے کہہ دیا کہ آج اس طوفانِ بے پناہ سے کسی کو پناہ نہیں مل سکتی تو انہوں نے دیکھا کہ کفار نے بڑے بڑے مٹکے لئے اور انہیں پانی میں ٹھیل کر، ان پر تیرنا شروع کر دیا۔ اس سے حضرت نوحؑ کو سخت قلق ہوا اور انہوں نے بدرگاہِ ربّ العزت دعا مانگی۔ اس پر اللہ میاں نے سخت تیز آندھی چلا دی جس سے وہ مٹکے آپس میں ٹکرا ٹکرا کر ٹوٹ گئے اور ان کے سہارے تیرنے والے سیلاب میں غرق ہو گئے ــــــ یہی نظارہ آج کل ہمیں اپنے ہاں دکھائی دے رہا ہے۔

ملک کی حالت یہ ہے کہ سندھ جل رہا ہے، بلوچستان سلگ رہا ہے، پنجاب تڑپ رہا ہے، سرحد مچل رہا ہے اور ہماری سیاسی پارٹیوں کے بعض ناعاقبت اندیش افراد ایسے ہی مٹکوں پر سوار ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریباں ہیں اور دُور سے ایک آواز پکار کر کہہ رہی ہے:

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَن يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّن فَوْقِكُمْ أَوْ مِن تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَيُذِيقَ بَعْضَكُم بَأْسَ بَعْضٍ (۶/۶۵)

"اللہ اس پر قادر ہے کہ تم پر آسمان سے عذاب نازل کر دے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے یا تم پارٹی بازی میں الجھ جاؤ اور اسطرح تم آپس میں ٹکرانے کا مزا چکھ لو"

نورِ مبین

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ۴/۱۷۵

موضوع آپ دیجئے! قرآنی راہنمائی طلوعِ اسلام پیش کرے گا!

ایڈیٹر

علامہ غلام احمد پرویزؒ کی معرکہ آراء کتاب "تبویب القرآن" سے ماخوذ

اعمال

(عمل — ایمان و عمل — اعمال صالحہ)

مادہ (ع۔م۔ل)۔ بمعنی کام۔ یہ لفظ بالعموم ہر اس کام کے لئے بولا جاتا ہے جو کسی جاندار سے بالارادہ سرزد ہو۔ بعض لغوین کا خیال ہے کہ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ کام محض ہنگامی طور پر سرزد نہ ہوگیا ہو بلکہ وہ عام طور پر کیا جاتا ہو۔ ایمان نام ہے احکام و قوانینِ خداوندی کی صداقت کو دل اور دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ تسلیم کر لینے کا اور عمل نام ہے ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے کا۔ وہ ایمان جس کی شہادت انسان کے اعمالِ حیات نہ دیں محض رسمی اقرار ہے جس کا کچھ فائدہ نہیں۔ اور وہ کام جن کا محرک انسان کا ایمان نہ ہو، وہ یا تو محض میکانکی (رسمی یا تقلیدی) طور پر سرزد ہوتے ہیں اور ہنگامی جذبات کے تابع۔ نتیجہ خیز اعمال وہی ہیں جو انسان سے اس کے دل و دماغ

کی رضامندی سے شعوری طور پر بالارادہ سرزد ہوں اور جن کے مطابق انسان کی پوری زندگی ڈھلی ہوتی ہو۔ (نیز دیکھئے عنوان "ایمان")۔

ہمارے ہاں عام طور پر "عمل" اور "کام" میں فرق کیا جاتا ہے۔ دنیاوی امور کے لئے کام کا لفظ بولا جاتا ہے اور عمل سے مراد ہوتی ہے مذہبی امور کی سرانجامدہی۔ مثلاً نماز روزہ وغیرہ۔ قرآن کی رُو سے یہ تفریق صحیح نہیں "عمل" انسان کے ہر کام کو کہتے ہیں۔ اعمال صالح کے معنی ہیں اچھے کام۔ یعنی وہ کام جن سے انسان کی صلاحیتیں نشوونما حاصل کریں اور معاشرہ کی ناہمواریاں دور ہوں۔

(۰)

جنت اور ہر قسم کے خوشگوار نتائج ایمان و عمل کا نتیجہ ہیں

(۱) ایمان و اعمال صالح (یعنی قرآن کریم کے مطابق اعمال) کا نتیجہ جنت ہے —— (۲ : ۲۵ ؛ ۸۲)
(۴ : ۵۷ ؛ ۱۲۲) — (۵ : ۹) — (۷ : ۴۲) — (۹ : ۷۲ ؛ ۸۸—۸۹) — (۱۰ : ۹) — (۱۱ : ۲۳-۲۴)
(۱۴ : ۲۳) — (۱۸ : ۲—۳ ؛ ۱۰۷—۱۰۸) — (۱۹ : ۶۰) — (۲۰ : ۷۵—۷۶) (۲۲ : ۱۴ ؛ ۵۶)
(۲۹ : ۵۸) — (۳۰ : ۱۵) — (۳۱ : ۸) — (۴۰ : ۷—۸) — (۴۰ : ۴۰) — (۴۲ : ۲۲) —
(۴۵ : ۳۰) — (۴۷ : ۱۲) — (۴۸ : ۲۹) — (۶۴ : ۹) — (۶۵ : ۱۱) — (۹۸ : ۷—۸) —

(۲) نیکی یہ نہیں کہ تم اپنا رُخ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ اصل نیکی ایمان اور اعمال صالح کی ہے۔ —— (۲ : ۱۷۷)

(۳) ایمان و عمل سے پورا پورا بدلہ ملتا ہے —— (۳ : ۵۶ ؛ ۱۹۴) — (۴ : ۱۲۴ ؛ ۱۷۳) — (۱۸ : ۳۰)

(۴) جو کوئی غلطی کر بیٹھے لیکن پھر قوانینِ خداوندی کو سامنے لے آئے اور اس طرح اپنی اصلاح کر لے اسے جنت مل جاتی ہے —— (۳ : ۱۳۴)

(۵) جو لوگ ہجرت کی نیت سے نکل کھڑے ہوتے اور پھر انہیں موت آ گئی تو ان کا اجر خدا کے ذمے ہے —— (۴ : ۱۰۰)

(۶) حاجیوں کو پانی پلا دینا اور مسجد حرام کی آرائش کر دینا عمل نہیں۔ جہاد عمل ہے۔ اس سے جنت ملتی ہے (۹ : ۱۹-۲۱)

(۷) جنت تو جان اور مال کی قیمتِ فروخت ہے —— (۹ : ۱۱۱)

(۸) جنت استقامت سے ملتی ہے —— (۱۱ : ۱۱)

(۹) طوبیٰ لھم و حسن مآب ــــ (۲۹ : ۱۳)

(۱۰) جنت اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے ــــ (۲۴ : ۷) ــ (۳۲ : ۱۶) ــ (۵۹ ــ ۵۸ : ۲۹) ــ (۷۴ : ۳۹)
(۷۳ : ۴۳) ــ (۱۶ : ۴۶) ــ (۲۴ : ۵۲) ــ (۱۲ ــ ۵ : ۷۶) ــ (۴۳ : ۷۷) ــ (۱۱ : ۸۵)
(۸۸ : ۹ ــ ۱۰)

(۱۱) ایمان و اعمال سے حیاتِ طیبہ ــــ (۹۷ : ۱۶)

(۱۲) ایمان و عمل سے اجرِ کبیر ــــ (۹ : ۱۷)

(۱۳) ایمان و اعمال صالح کا بدلہ بہت اچھا ملتا ہے ــــ (۸۸ : ۱۸) ــ (۱۱۲ : ۲۰) ــ (۹۴ : ۲۱) ــ (۸۰ : ۲۸)
(۹ ؛ ۷ : ۲۹) ــ (۴۵ ــ ۴۴ : ۳۰) ــ (۳۰ ــ ۲۹ ؛ ۸ : ۳۵) ــ (۷۰ : ۳۹) ــ (۸ : ۴۱) ــ
(۲۰ : ۷۳) ــ (۲۵ : ۸۴) ــ (۶ : ۹۵)

(۱۴) صحیح توبہ، ایمان و عمل کا نام ہے ــــ (۷۱ ــ ۷۰ : ۲۵) ــ (۶۷ : ۲۸)

(۱۵) ایمان و عملِ صالح سے حالت سنور جائے گی ــــ (۲ : ۴۷)

(۱۶) جو خدا کی راہ میں قتل ہوئے ان کے اعمال رائیگاں نہیں جائیں گے ــ (۴ : ۴۷)

(۱۷) ایمان و اعمال سے ایسی تجارت حاصل ہوتی ہے جس میں نقصان کا امکان نہیں ــ (۱۳ ــ ۱۰ : ۶۱)

(۱۸) صالح مومن حضورؐ کے ساتھی تھے ــــ (۴ : ۶۶)

(۱۹) مومنین کی صفات ــ اعمالِ حسنہ یعنی بلندیٔ کردار ــــ (۳۵ ــ ۲۲ : ۷۰)

(۲۰) انسان وحی کی راہ نمائی کے بغیر تباہی میں رہتا ہے۔ ایمان و اعمالِ صالح سے اس سے حفاظت مل سکتی
ہے ــــ (۳ : ۱۰۳)

ایمان و عمل کا نتیجہ بےخوفی

(۱) آدم سے کہا گیا کہ جو بھی خدا کی راہ نمائی کا اتباع کرے گا اسے خوف و حزن نہیں ہوگا ــــ (۳۸ : ۲)
(۴۸ : ۶) ــــ (۳۵ : ۷)

(۲) مسلمان ہوں، یہود، نصاریٰ، صابئین ہوں جو بھی خدا اور آخرت پر (قرآن کے مطابق) ایمان لائیں گے،
اور اعمالِ صالح کرینگے، ان کا اجر ملے گا۔ انہیں خوف و حزن نہیں ہوگا ــــ (۶۲ : ۲) ــ (۶۹ : ۵)

(۳) ایمان وعمل سے ولی اللہ بنتا ہے اور اس کی نشانی خوف وحزن سے مامونیت ہے ــــ (۶۴-۶۲ : ۱۰)
(۴) کفرانِ نعمت سے بھوک اور خوف کا عذاب مسلط ہو جاتا ہے ــــ (۱۱۲ : ۱۶)
(۵) ایمان و استقامت سے خوف وحزن نہیں رہتا ــــ (۱۳ : ۴۶)

ایمان بلا عمل کچھ فائدہ نہیں دیتا

(۱) جو ایسے وقت ایمان لائے جب عمل کا موقعہ ہی باقی نہ ہو تو اس کا ایمان نفع بخش نہیں ہو سکتا ــــ (۱۵۹ : ۶)
(۲) دعوئے ایمان کے ساتھ اگر اطاعت نہیں تو وہ ایمان بے کار ہے ــــ (۲ : ۹۳)
(۳) سود خوار مسلمان کے لئے وہی جہنم ہے جو کفار کے لئے تیار کی گئی ہے ــــ (۳۰-۱۲۹ : ۳)
(۴) کیا تم سمجھتے ہو کہ جہاد کے بغیر جنت میں چلے جاؤ گے؟ ــــ (۱۴۱ : ۳) ــــ (۱۶ : ۹) ــــ (۲-۱ : ۲۹)
(۵) جو لوگ چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف ان کاموں کی بنا پر کی جائے جنہیں وہ کرتے نہیں، وہ عذاب سے نہیں بچ سکتے ــــ (۱۸۷ : ۳)
(۶) جنہوں نے بلا عذر ہجرت نہیں کی وہ عذاب سے نہیں بچ سکتے ــــ (۹۹-۹۷ : ۴)
(۷) محض مقدس آرزوؤں سے کچھ نہیں بنتا۔ اگر مسلمان بھی غلط کار ہوگا تو سزا بھگتے گا ــــ (۱۲۳ : ۴)
(۸) جنت، اعمال کے بدلے میں ملتی ہے ــــ (۴۳ : ۷) ــــ (۳۲ : ۱۶) ــــ (۹۷ : ۱۶) ــــ (۲۴ : ۵۶)
(۹) میدان جنگ میں پیٹھ دکھا جانے والا سیدھا جہنم میں جائے گا ــــ (۱۶ : ۸)
(۱۰) جن لوگوں نے ہجرت کی اور جنہوں نے انہیں پناہ دی (یعنی مہاجر اور انصار) یہ مومن حقاً تھے جنہوں نے ہجرت نہیں کی، ان کی حمایت بھی فرض نہیں تھی ــــ (۷۵-۷۲ : ۸)
(۱۱) اگر دنیا کی کوئی جاذب چیز بھی خدا اور رسول سے زیادہ عزیز ہو گئی تو خدا کے عذاب کا انتظار کرو ــــ (۲۴ : ۹)
(۱۲) جہاد کے لئے نہیں نکلو گے تو تمہاری جگہ دوسری قوم آجائے گی ــــ (۳۹ : ۹)
(۱۳) صحیح ایمان والا عمل سے جی نہیں چرائے گا ــــ (۴۴ : ۹)
(۱۴) منافق کی پرکھ عمل کے وقت ہوتی ہے۔ ان سے معاشرتی تعلقات بھی نہیں رکھنے چاہئیں ــــ (۸۱-۷۵ : ۹)
(۱۵) دعویٰ بلا عمل محض شاعری ہے۔ مومن کا شعار ایمان با عمل ہے ــــ (۲۲۷-۲۲۶ : ۲۶)
(۱۶) عملِ صالح، خدا کے نظریۂ حیات کو بلند کرتا ہے ــــ (۱۰ : ۳۵)

(۱۷) اطاعت نہ کی جائے تو اعمال غارت ہو جاتے ہیں ——— (۴۷ : ۳۳)
(۱۸) انفاق فی سبیل اللہ نہیں کرو گے تو تمہاری جگہ خدا دوسری قوم لے آئے گا ——— (۴۷ : ۳۸)
(۱۹) جہاد سے جی چرایا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا ایمان ہی نہیں ——— (۴۸ : ۱۱-۱۳)
(۲۰) اطاعت کرو گے تو سمجھا جائے گا کہ ایمان تمہارے دل میں اُتر گیا ہے ——— (۴۹ : ۱۴)
(۲۱) جو لوگ ایمان لائے اور پھر جہاد کیا تو یہ لوگ اپنے دعوےٰ ایمان میں سچے ہیں ——— (۴۹ : ۱۵)
(۲۲) حدود اللہ کی پاسداری سے ایمان کی شہادت ملتی ہے ——— (۵۸ : ۴)
(۲۳) جو بات کہتے ہو وہ کر کے کیوں نہیں دکھاتے ——— (۶۱ : ۲-۳)
(۲۴) تورات پر ایمان کے مدعی لیکن اس پر عمل نہ کرنے والے، اس گدھے کی مانند ہیں جس پر کتابیں لدی ہوں ——— (۶۲ : ۵)
(۲۵) جس نے اپنے ایمان کے ساتھ عملِ خیر شامل نہ کیا اس کا ایمان اسے فائدہ نہیں دے سکتا ——— (۶ : ۱۵۹)

عمل بلا ایمان نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا

(۱) عمل کے لئے ایمان شرط ہے ——— (۴ : ۱۲۴)
(۲) اہل کتاب اگر قرآن پر ایمان نہیں لاتے تو انہیں مومن نہیں کہا جا سکتا ——— (۲ : ۹۱)
(۳) جو دین سے مرتد ہو جائے اس کے اعمال رائیگاں جاتے ہیں ——— (۲ : ۲۱۷)
(۴) اہل کتاب اگر ایمان لائیں گے اور تقویٰ اختیار کریں گے تو جنت مل سکے گی ——— (۵ : ۶۵)
(۵) جو ایمان نہیں لاتے ان پر رجس مسلط ہو جاتی ہے ——— (۶ : ۱۲۶)
(۶) ظاہر داری کے رسمی اعمال بے معنی ہیں ——— (۲ : ۱۷۷) ——— (۹ : ۱۹-۲۱)
(۷) مسجد ضرار کا واقعہ ——— (۹ : ۱۰۷-۱۰۹)
(۸) آخرت پر ایمان نہ لانے سے عذاب ——— (۱۷ : ۱۰)
(۹) طبعی امور میں البتہ ایمان کا سوال نہیں ہوتا ——— (۱۷ : ۱۸-۲۱)۔ یعنی قوانینِ فطرت کے مطابق عمل کرنے والا مسلم ہو یا غیر مسلم، اسے اس کے کام کا نتیجہ مل جاتا ہے۔
(۱۰) ایمان کے بغیر اعمال رائیگاں جائینگے۔ ایسے اعمال کے لئے میزان تک کھڑی نہیں جائے گی ——— (۲ : ۲۱۷)

(۳:۲۱)—(۵۱۵ ; ۵۳)—(۶:۸۹)—(۷:۱۴۷)—(۹:۱۷ ; ۶۹)—(۱۱:۱۶)—
(۱۸:۱۰۳—۱۰۵)————(۳۳:۱۹)—(۴۷:۱ ; ۹ ; ۲۸ ; ۳۲)—(۴۹:۲)—

(۱۱) اعمال کے ساتھ توحید ضروری ہے — (۱۸:۱۱۰)

(۱۲) ایمان کے ساتھ باقی خوبیاں ہونی چاہئیں — (۱۷:۹۰)

کام کرنیوالے اور نہ کرنیوالے برابر نہیں ہوسکتے

(۱) مجاہدین اور بیٹھے رہنے والے برابر نہیں ہوسکتے — (۴:۹۵)

(۲) خدا، انسانوں کا دوست ان کے اعمال کی بنا پر ہوتا ہے — (۶:۱۲۸)—(۱۰:۶۲—۶۴)

(۳) مدارج کا تعین اعمال کے مطابق ہوتا ہے — (۶:۱۳۳)—(۹:۱۹—۲۱)—(۲۰:۷۵)
—(۴۶:۱۹)—(۵۸:۱۱)

(۴) رسمی اور فروعی کام نیکیاں نہیں۔ اصل نیکی مجاہدانہ زندگی بسر کرنا ہے — (۲:۱۷۷)

(۵) غم اور خوشی اعمال کی وجہ سے ہے — (۹:۸۲)

(۶) خدا کا قرب اور رسول کی دعائیں اعمال کی وجہ سے حاصل ہوتی ہیں — (۹:۹۸—۹۹)

(۷) ایمان کی پہچان عمل سے ہوتی ہے — (۹:۱۰۵)—(۲۴:۵۳)

(۸) مجاہدین کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، سب نیکیوں میں شمار ہوتا ہے — (۹:۱۲۰)

(۹) امم سابقہ کے بعد تمہیں استخلاف فی الارض دیا، یہ دیکھنے کے لئے کہ تم کیسے کام کرتے ہو — (۷:۱۲۹)
—(۱۰:۱۴)—(۱۶:۹۳)

(۱۰) تمام انبیاء کو اعمالِ صالح کی تاکید — (۲۳:۵۱)

(۱۱) شعراء زبان سے وہ کچھ کہتے ہیں جو کر کے نہیں دکھاتے۔ یعنی ایمان کا دعویٰ بلا عمل محض شاعری ہے۔ مومن ایمان کے ساتھ اعمال صالح کا مظاہرہ کرتا ہے — (۲۶:۲۲۶—۲۷)

(۱۲) دنیا میں ایمان و اعمالِ صالح والے اور مفسدین یکساں نہیں ہوسکتے — (۳۸:۲۸)—(۴۰:۵۸)
—(۴۵:۲۱)

(۱۳) قبل از فتح اور بعد فتح انفاق کرنے والے بھی برابر نہیں ہوسکتے — (۵۷:۱۰)

دین کی صداقت کی نشانی، مومنین کے اعمال کے نتائج ہیں

(۱) کفار سے کہا گیا کہ تم اپنی جگہ کام کر دیں اپنی جگہ کرتا ہوں۔ نتائج خود بتا دیں گے کہ کامیابی کس کے حصے میں آتی ہے — (۶ : ۱۳۶) — (۱۱ : ۱۲۱)

(۲) جو شخص صرف دنیاوی مفاد چاہتا ہے اسے یہ مل جاتے ہیں جو دنیا اور آخرت کے مفاد چاہتا ہے، اُسے وہ مل جاتے ہیں۔ یہ ایمان و عمل کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اول الذکر صرف طبعی امور کے نتائج ہوتے ہیں جن کیساتھ ایمان کی شرط نہیں — (۱۷ : ۱۸—۲۱)

(۳) وراثتِ ارض، عباد الصالحون کے لئے ہے — (۲۱ : ۱۰۵)

(۴) ایمان و عملِ صالح سے رزقِ کریم (عزت کی روٹی) — (۲۲ : ۵۰)

(۵) ایمان و اعمالِ صالح کا لازمی نتیجہ اس دنیا میں حکومت و تمکن ہے۔ اسی سے دین کا قیام اور توحید کا ثبات ہوتا ہے — (۲۴ : ۵۵)

ایمان و اعمالِ صالحہ

(۱) اس کا اجر خدا سے ملے گا — (۲ : ۶۲ ; ۲۷۷) — (۳ : ۵۶ ; ۱۹۴) — (۴ : ۱۷۳) — (۱۰ : ۴) — (۱۸ : ۳۰) — (۱۸ : ۸۸) — (۲۱ : ۹۴) — (۲۴ : ۳۸) — (۲۸ : ۸۰) — (۳۰ : ۴۵) — (۳۴ : ۴) — (۳۴ : ۳۷) — (۴۱ : ۸) — (۸۴ : ۲۵) — (۹۵ : ۶)

(۲) خوف و حزن نہیں ہوگا — (۵ : ۶۹) — (۲۰ : ۱۱۲)

(۳) اس سے خوشگوار زندگی نصیب ہوگی — (۱۶ : ۹۷) — (۳۰ : ۴۴)

(۴) توبہ اور اعمالِ صالح کا خوشگوار نتیجہ — (۶ : ۵۴) — (۷ : ۱۵۳) — (۱۹ : ۶۰) — (۲۰ : ۸۲) — (۲۵ : ۷۰ ; ۷۱) — (۲۸ : ۶۷)

(۵) بلند مدارج — (۶ : ۱۳۳) — (۲۰ : ۷۵) — (۴۶ : ۱۹) — (۵۸ : ۱۱)

(۶) جنّت — (۲ : ۲۵ ; ۸۲) — (۳ : ۱۳۵) — (۴ : ۵۷ ; ۱۲۲ ; ۱۲۴) — (۱۱ : ۲۳) — (۱۴ : ۲۳) — (۱۸ : ۱۰۷) — (۲۲ : ۱۴ ; ۲۳) — (۲۲ : ۵۶) — (۲۹ : ۵۸) — (۳۰ : ۱۵) — (۳۱ : ۸) — (۳۲ : ۱۹)

(۴۰ : ۴۰)—(۴۲ : ۲۲)—(۴۷ : ۱۲)—(۱۱ : ۶۵)—(۱۱ : ۸۵)

(۷) دعوتِ الی اللہ اور عملِ صالح — (۳۳ : ۴۱)

(۸) ہر عملِ صالح اپنی ذات کے لئے ہوتا ہے — (۴۱ : ۴۶) — (۱۵ : ۴۵)

(۹) مغفرت اور اجرِ عظیم — (۹ : ۵)—(۱۱ : ۱۱)—(۹ : ۱۷)—(۲ : ۱۸)—(۵۰ : ۲۲)—(۲۴ : ۲۶) — (۳۵ : ۷)—(۳۰ : ۴۵)—(۲۹ : ۴۸)

(۱۰) انسانی ذات کی وسعت ہوتی ہے—(۴۲ : ۷)

(۱۱) ہدایتِ خداوندی — (۹ : ۱۰)

(۱۲) طوبیٰ لہم وحسن مآب — (۲۹ : ۱۳)

(۱۳) مودّتِ خداوندی — (۹۶ : ۱۹)

(۱۴) استخلاف فی الارض — (۵۵ : ۲۴)

(۱۵) ناہمواریاں دور ہو جائیں گی۔(۷ : ۲۹)—(۲ : ۴۷)—(۹ : ۶۴)

(۱۶) صالحین میں شمار ہوگا — (۹ : ۲۹)

(۱۷) یہ لوگ باہمی معاملات میں دھاندلی نہیں کرتے۔(۲۴ : ۳۸)

(۱۸) ایمان و اعمالِ صالح والوں کی حالت دنیا میں مفسدین جیسی نہیں ہو سکتی — (۲۸ : ۳۸)—(۵۸ : ۴۰)
نہ انکی زندگی ایک جیسی نہ موت — (۲۱ : ۴۵)

(۱۹) خوشگواریوں کی بشارت — (۲۳ : ۴۲)

(۲۰) ظلمات سے نور کی طرف اخراج — (۱۱ : ۶۵)

(۲۱) یہ خیرالبریہ (بہترین مخلوق) ہیں — (۷ : ۹۸)

(۲۲) یہ خسارے میں نہیں رہتے — (۳ : ۱۰۳)

(۲۳) مرنیوالے کی حسرت کہ ایک بار موقعہ مل جائے تو میں عملِ صالح کروں — (۲۳ : ۱۰۰)—(۳۲ : ۱۲)—(۳۵ : ۳۷)

(۲۴) انبیاء کی آرزو۔ عملِ صالح کی — (۱۹ : ۲۷)

(۲۵) مومنین کی آرزو — (۱۵ : ۴۶)

(۲۶) رسولوں کو حکم کہ عملِ صالح کریں — (۲۳ : ۵۱)—(۱۱ : ۳۴)

(۲۷) جو تمہارا رب چاہتا ہے وہ عملِ صالح کرے — (۱۸ : ۱۱۰)

(۲۸) حضرت نوحؑ کے بیٹے کے اعمال غیر صالح تھے — (۱۱ : ۴۶)

متفرقات

(۱) ایمان و اعمالِ صالح سے سابقہ لغزشوں کی تلافی ہو جاتی ہے — (۹۳ : ۵)

(۲) سلسلۂ کائنات اعمال کے نتائج مرتب کرنے کے لئے سرگرمِ عمل ہے — (۷ : ۱۱)

(۳) دنیا کی زینت وجہِ جاذبیت ہے۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ تم میں سے کون اچھے کام کرتا ہے — (۷ : ۱۸)

(۴) مال اور اولاد میں کشش ضرور ہے لیکن بقا اعمال صالح کے لئے ہی ہے — (۴۶ : ۱۸)—(۷۶ : ۱۹)

(۵) ایمان و اعمالِ صالح سے محبت پیدا ہوگی — (۹۶ : ۱۹)

مجبوریاں

غالباً کنفیوشس کا قول ہے کہ:

"عورت کا جو قدم آگے بڑھ جائے اسے پیچھے لوٹانا قدرت کے بس میں بھی نہیں رہتا"

جب ہمیں نئی نئی آزادی ملی تو ہماری "اعلیٰ سوسائٹی" کی "بیگمات" ایک دوسری کی دیکھا دیکھی اچھلتی، پھاندتی، ایک دو نہیں، دس دس بیس بیس قدم آگے بڑھ گئیں۔ مرد خوش تھے کہ "بیگمات" مہذب (UP TO DATE) بن رہی ہیں۔ اب جو ذرا طوفان تھما ہے تو بیٹھے سوچ رہے ہیں کہ یہ کیا ہو گیا؟ نہ کہیں حیا ہے نہ غیرت نہ شرم ہے نہ جوہر لنسائیت۔ گھروں کی جنتیں جہنم میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ اولاد آوارہ ہو رہی ہے۔ اطمینان و سکون مفقود ہو چکا ہے۔ اقتصادی حالت تباہ کن درجہ تک پہنچ چکی ہے۔ وہ صورتِ آئینہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں اور چپ ہیں۔ یقین مانئے! تہذیبِ حاضر کی اِن تیتریوں کی اِن بے باکیوں کو جس قدر آپ محسوس کر رہے ہیں اس سے کہیں زیادہ ان کے شوہر محسوس کرتے ہیں، لہٰذا ان پر غصہ نہ کیجئے، ان بے چاروں پر ترس کھائیے! کہ یہ بہت بے بس اور مجبور ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس طوفانِ بدتمیزی کو اس طرح بدلگام چھوڑ دیا جائے۔ اس کا علاج نہائت ضروری ہے ورنہ آپ کی آنے والی نسلوں میں اخلاق اور بداخلاقی کی تمیز باقی نہیں رہے گی۔

اس کا علاج بھی چنداں مشکل نہیں۔ نمائشِ حسن کے جذبہ کی تسکین، دیکھنے والوں کی نگاہوں سے ہوتی ہے۔ آپ اپنی نگاہوں کو روک لیجئے! یہ نمائش خود بخود ختم ہو جائیگی۔ کسی ایسے اجتماع میں شریک نہ ہوں، جہاں عورتوں کی اِن بے باکیوں کا مظاہرہ ہو رہا ہے کچھ عرصہ کے بعد آپ دیکھیں گے کہ یہ جذبۂ نمائش کس طرح ٹھٹھر کر رہ جاتا ہے۔ اس لئے کہ ہمارے ایک رنگین غزل گو شاعر کے الفاظ میں :-

جو مجھ کو گُدگدائے، وہ جوبن کا ہے اُبھار
جو تم کو گُدگدائے، وہ میری نگاہ ہے

اپنی نگاہ کو روک لیجئے! حسنِ عریاں، جوہرِ مستور بننے پر مجبور ہو جائے گا۔

(ماخوذ از طلوعِ اسلام، جون سنہ ۱۹۴۹ء)

جمیلہ خاتون
(بھارت)

تیسری قسط

عورت اور قرآن

غیر مسلم عورتوں کے طفیل بعض مشرقی و مغربی ممالک کی مسلمان عورتوں کی آزادی بلاشبہ قابلِ ذکر ہے۔ مگر وہاں چونکہ "اسلامیت" پر "مغربیت" حاوی ہے اس لئے قرآنی تعلیمات کا لحاظ نہیں کیا گیا اور نہیں کیا جاتا۔ ترکی ضرور اسلامی ملک ہے اور وہاں ۱۹۳۵ء میں عورتوں نے "کامل آزادی" حاصل کر لی تھی۔ مگر وہ مشرق و مغرب کا سنگم ہے اس لئے اسے بھی مثال میں پیش کرنا صحیح نہ ہوگا۔۔۔ ہم "مشرقی عورتوں" کے لئے ایک دقّت یہ بھی ہے کہ ہم آزادی کے حصول میں نہ تو "اسلامیت" کو نظر انداز کر سکتے ہیں اور نہ "مشرقیت" کو قربان، اس لئے کہ وہ ہماری فطرت کی صحیح ترجمان ہے۔ لہٰذا ہمارا بہترین راستہ حقیقتاً یہ ہے کہ ہم اندھا دھند جذباتی طور پر مغرب کی یا مغرب زدہ ملکوں کی عورتوں کی ریس کرنے کی بجائے اپنے وہ جائز حقوق حاصل کرنے کی جدّوجہد کریں جو ہماری فطری اور مشرقی خصوصیات کو نقصان پہنچائے بغیر "قرآنِ مجید" نے عطا کئے ہیں کہ یہی ایک صورت ہماری فلاح کی ہے اور ہوگی، اور اسی کی روشنی میں حاصل کی ہوئی آزادی میں اللہ تعالےٰ استقامت بھی عطا فرمائے گا۔ وگرنہ اگر ہم نے بلا سوچے سمجھے "یورپ" کی عورتوں کی تقلید کرنی چاہی تو یہ قرآنی لفظوں میں "طغیٰ" ہوگا یعنی "خدائی حدود سے متجاوز ہو جانا" جو ازروئے قرآنِ مجید اقوامِ گذشتہ کی عبرت انگیز تباہی و بربادی کا سبب ہوا ہے اور جس سے قرآنِ مجید میں مسلمانوں کو، چاہے وہ "مرد" ہوں یا "عورت"، بڑی سختی سے روکا گیا ہے۔ اور اسی لئے امتِ مسلمہ کو مثالی حیثیت سے اعتدال پر بنایا گیا ہے:

كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (البقرۃ)

"اس طرح ہم نے تم کو ایک ایسی امت بنایا جو اعتدال پر ہے تاکہ تم لوگوں کے نگران ہو"

قرآنِ مجید میں جو قصے ہیں۔ چاہے وہ قوموں کے ہوں یا افراد کے، مردوں کے ہوں یا عورتوں کے اسی لئے بیان کئے گئے ہیں کہ لوگ ان پر غور و فکر کریں اور ان سے سبق لے کر "خدائی حدود" پھاندنے سے بچیں۔ اسی لئے دنیا میں "تاریخ" کی بڑی اہمیت ہے۔ مگر بدنصیبی یہ ہے کہ:-

رُسوا کیا اس دَور کو خلوت کی ہوس نے ——— روشن ہے نگہ، آئینۂ دِل ہے مکدر
بڑھ جاتا ہے جب ذوقِ نظر اپنی حدوں سے ——— ہو جاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر
آغوشِ صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے ——— وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر (اقبالؒ)

ظاہر ہے کہ اس روشنی میں کچھ غور و فکر کے لئے قرآنِ مجید کا جاننا ضروری ہے مگر اس کا علم عام طور پر ہم عورتوں کو نہیں ہے۔ "مسلمان عورتوں" کے مسائل و حقوق سے متعلق اردو زبان میں ایک تو کتابیں لکھی ہی بہت کم گئی ہیں۔ دوسرے جو چھوٹی یا بڑی دو چار کتابیں اسی سلسلے کی ہیں بھی، ان میں "عورت" کے کسی مسئلہ اور حق پر محض دستورِ اسلامی یعنی صرف قرآنِ مجید کی روشنی میں اظہارِ خیال نہیں کیا گیا ہے۔ مصنف حضرات جس مسئلے سے بحث کرتے ہیں اسے "اسلامی نقطۂ نظر" کہتے ہیں اور اسلام ان کے یہاں صرف قرآنِ مجید میں نہیں ہے بلکہ اسلام میں ان کے نزدیک قرآنِ مجید کے علاوہ اور بھی بہت سے انسانوں کی لکھی ہوئی بے شمار کتابیں داخل اور شامل ہیں اور پھر یہ کتابیں یا ان کے مضامین بھی مسلمہ نہیں جن پر جمہور کا اتفاق ہو۔ حالانکہ چاہیئے یہ تھا کہ قرآنِ مجید کی آیات پیش کر کے قرآنِ مجید اور صرف قرآنِ مجید ہی کی روشنی میں ان مسائل و حقوق کو سمجھایا جاتا۔ تاکہ ہمیں "فقہا اور علماء کا خیال" نہیں بلکہ "خدا کا حکم" معلوم ہوتا۔ پھر ان موجودہ کتابوں میں کوئی بھی "عورت" کے تمام مسائل اور حقوق پر حاوی نہیں ہے۔ کسی مصنف نے ایک مسئلے کو لے لیا اور پوری کتاب لکھ ڈالی، بعض نے دو چار حقوق لے کر ان پر زورِ قلم صرف کیا۔ اور پھر ان میں تحریر کا انداز یہ ہے یا ہوتا ہے کہ گویا وہ حقوق "عورت" کو "خدا" نے نہیں "مردوں" نے دیئے ہیں جن کے احسان سے ہم کبھی بھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ غرض اس وقت اردو زبان میں کوئی ایسی کتاب موجود نہیں ہے جس میں کلامِ پاک کی صرف وہ آئیتیں پیش کی گئیں ہوں جو عورت سے متعلق ہیں تاکہ ایک مسلمان عورت اگر یہ جاننا چاہے کہ قرآنِ مجید میں ہمارے لئے بطور خاص کیا کیا احکام ہیں۔ اور وہ کہاں کہاں پر ہیں، تو وہ انہیں دیکھ اور پا سکے۔ حالانکہ اللہ تعالےٰ کے نزدیک عورت کی ایسی ہی اہمیت ہے کہ اس نے اپنی مقدس کتاب میں کوئی سورۂ "الرجل" (مرد) کے نام سے تو نازل اور منسوب و معنون نہیں کی ہے مگر ایک مستقل سورۃ "النسآء" (عورت) کے عنوان سے نازل اور منسوب و معنون کی ہے جو سورہ بقرہ اور اعراف کے بعد قرآنِ مجید کی سب سے بڑی سورہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم پاکستانی و ہندوستانی مسلمان عورتیں قرآنِ مجید کی تلاوت [1] ہر گھر میں کرتی ہیں ——— مگر جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ شروع ہی سے یہ خیال رکھا گیا کہ مسلمان عورت قرآن شریف سے باخبر نہ ہونے پائے اس لئے نہ ہمیں

[1] تلاوت کے معنی پیچھے پیچھے چلنا ہیں۔ یعنی جو قرآن رہبری کرتا ہے اس کی تقلید کرو۔ مگر مسلمانوں کے ہاں اس کا مطلب بے سمجھے بوجھے الفاظ کو دہرانا ہو گیا۔

باضابطہ اتنی تعلیم دلائی جاتی ہے کہ ہم اپنے حقوق و مسائل کا احساس و ادراک کر سکیں۔ نہ ہماری زبان عربی ہے۔ کہ ہم قرآن مجید کی تلاوت کے وقت اس کو سمجھ سکیں۔ نہ قرآن مجید کو ہمیں ترجمہ کے ساتھ باقاعدہ پڑھایا جاتا ہے کہ ہمیں کچھ معلوم ہو سکے۔ حد تو یہ ہے کہ عام طور سے جہیز کے سامانوں کے ساتھ قرآنِ مجید کا جو نسخہ دیا جاتا ہے وہ بھی بطورِ خاص یہ دیکھ کر کہ وہ بے ترجمہ ہو تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ عورت یہ جان لے کہ خدا نے مسلمان عورت کو کیا کیا حقوق دیئے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب کے وجود میں آنے کا محرک یہی جذبہ ہے

اسلام کا دستور العمل قرآنِ مجید ہے اور بعض فروع کے ساتھ، ورنہ سارے اصول اس میں موجود ہیں۔ اب اگر یہ کتاب "عورت" کے سامنے رہی تو اسے معلوم رہے گا کہ عورت سے متعلق قرآنِ مجید میں یہی کچھ ہے۔ بقیہ قرآنِ مجید اصولی حیثیت رکھتا ہے۔ عبادات و معاملات میں قرآنِ مجید نے کوئی تفریق نہیں کی ہے۔ معاشرتی اور سماجی مسائل میں عورت اور مرد دونوں کو مساوی حق دیا گیا ہے۔ نماز، روزہ، حج زکوٰۃ وغیرہ جس طرح مرد پر فرض ہیں، اسی طرح عورت پر، سچ بولنا، جھوٹ سے پرہیز کرنا، چوری، جوا، حرام سے بچنا، دوسروں کی تحقیر و تذلیل نہ کرنا، لوگوں کا نقصان نہ کرنا، یتیموں کا مال نہ کھانا، تکبر نہ کرنا، امانت میں خیانت نہ کرنا، غیبت، تمسخر، عیب چینی اور چغلی سے احتراز کرنا۔ غرض جس قدر بھی اخلاقی مسائل و فرائض ہیں وہ دونوں کے لئے یکساں ہیں۔ مثلاً علم کو لیجئے کہ اس میں مرد اور عورت کی کوئی تخصیص نہیں۔ خدا شناسی کے لئے حصولِ علم کا عام حکم ہے دونوں کے لئے یکساں لازمی حیثیت رکھتا ہے۔

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (فاطر ۴)

"خدا سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو صاحبِ علم ہوتے ہیں"

ظاہر ہے کہ اس آیت کی روشنی میں خدا سے ڈرنے کے لئے بندے کا علم حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس لئے کہ خدا شناسی کا انحصار اسی پر ہے اور اس علم کے حصول کے لئے نہ مرد کی تخصیص کی گئی ہے نہ عورت کی۔ خدا کے بندے مرد بھی ہیں عورت بھی۔ اور خدا سے ڈرنا مرد کے لئے بھی ضروری ہے اور عورت کے لئے بھی۔ لہٰذا جس علم سے بھی دماغ میں روشنی، عقل میں جلا اور نفس میں پاکیزگی آئے اُسے جس طرح مرد حاصل کرتے ہیں اسی طرح عورت کو بھی حاصل کرنا چاہیئے مگر ہاں اس میں بھی کلام نہیں ہے کہ بقول حضرت علامہ اقبالؒ:

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت

رہے وہ مسائل جن کی جزئیات قرآن نے متعین نہیں کیں ــــ اور ایسے مسائل ملیں گے اس لئے کہ ــــ

نزولِ قرآن کے وقت جب خدائی احکام کو زیادہ سے زیادہ جاننے کے متمنی مومنین، ہر باب میں واضح ہدایت چاہتے تھے تو اللہ تعالےٰ نے انتہائی کرم فرمائی اور رحمت کے پیشِ نظر یہ کہہ کے روک دیا تھا کہ

— اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْئَلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ (بقرہ ۱۳)

"کیا تم چاہتے ہو کہ تم بھی اپنے رسول سے ویسے ہی سوال کرو جیسا کہ اس سے پہلے موسیٰ سے کئے جا چکے ہیں"

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَاِنْ تَسْئَلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ (مائدہ ۱۴۰)

"مسلمانو! اپنی طرف سے کاوشیں کر کے ان چیزوں کی نسبت سوالات نہ کرو کہ اگر تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں گوارا نہ ہوں. اگر ان چیزوں کے بارے میں سوال کرو گے جبکہ قرآن نازل ہو رہا ہے تو ظاہر کر دی جائیں گی۔ خدا نے تم کو یہ بات معاف کر دی اور وہ بڑا بخشنے والا بُردبار ہے۔"

شریعت بل

پرچہ پریس جا رہا تھا، خبر ملی کہ شریعت بل سینٹ نے منظور کر لیا ہے صدرِ مملکت اور وزیرِ اعلیٰ پنجاب نے سینیٹر سمیع الحق کو شریعت بل کی منظوری پر مبارکباد پیش کی ہے۔ بل کا مسودہ تو ہمیں دستیاب نہیں ہو سکا، تاہم سینیٹر سمیع الحق صاحب کے اخباری بیان کے مطابق قومی اسمبلی میں اس بل کی منظوری کے بعد تمام امورِ مملکت قرآن وسنّت کے مطابق سرانجام پائیں گے۔ چلئے ایک بات تو طے ہوئی کہ اس بل کی منظوری کے بعد مسلمانوں میں کم از کم فرقوں کا وجود باقی نہیں رہے گا۔ کیونکہ شیعہ۔ سنّی۔ اہلِ حدیث۔ اہلِ فقہ، دیوبندی، بریلوی نام کے فرقوں کا ذکر نہ قرآن میں ہے نہ عہدِ رسالتؐ میں ان کا وجود تھا۔ لہٰذا اراکینِ قومی اسمبلی سے ہماری استدعا ہے کہ اس بل پر مہرِ تصدیق ثبت کرنے سے پہلے ملک میں موجود تمام فرقوں کے قائدین سے یہ عہد لیں کہ شریعت بل نافذ ہونے پر وہ سب اپنے اپنے فرقے ختم کر کے قرآن وسنّت کے مطابق صرف اور صرف مسلمان کہلائیں گے۔

صوبیدار میجر، محمود الحسن۔ بوریوالہ

اُمّتی باعثِ رُسوائیٔ پیغمبر ہیں

_____ کچھ قرآن و حدیث کی باتیں بھی سنایا کیجیئے مولانا!
" واہ کیا بات کہی! قرآن و حدیث تو بفضلِ تعالےٰ حفظ سمجھیۓ!!
مولانا نے حافظے پر زور دے کر کہا:۔
اللہ بخشے! استاد مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ بخاری شریف میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ
کو دو۲ خوبیاں بہت پسند ہیں!
پھر قدرے توقّف کے بعد کہا:۔
ایک خوبی استاد بھول گئے اور دوسری مجھے یاد نہیں"

درست کہا کسی بندۂ آخر بیں نے کہ____ قصص الاوّلین مواعظ الآخرین____ قصص و روایات بالخصوص انبیاء کے قصص کو مذہبی ادب میں اہم مقام حاصل ہے۔ اگرچہ اس کا معتدبہ حصّہ از قبیلِ اسرائیلی خرافات درج ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن سوہاروی نے اپنی کتاب "قصص القرآن" میں اِس اَمر پر اظہارِ افسوس کیا ہے کہ بعض مفسّرین نے یہودی مفوات کو قرآن کریم کی تفسیر میں شامل کر لیا ہے۔

انبیاء و اولیاء کی سیرتِ طیبہ کے تذکرے داخلی و خارجی شواہد کی تصدیق سے آخرین کے لئے یقیناً مواعظِ حسنہ ہیں۔ ان میں انفاق، ایثار اور انسانی ہمدردی کے اعلیٰ نمونے بھی اور نفس کشی کے عمدہ مظاہر بھی۔ صوفیاء کے ہاں ہمدردی صرف مسلمانوں اور انسانوں تک محدود نہیں، ان میں جانوروں تک سے دردآشنائی کے حیرت انگیز واقعات ملتے ہیں۔ اور یہ اشارہ ملتا ہے کہ بیمار جانوروں کی دیکھ بھال عبادت سے بلند تر مقام رکھتی ہے۔ یہ قصّے زیادہ تر مثالیہ (PARABLE) ٹائپ ہیں جس کی مذہبی کتب میں بڑی اہمیّت ہے۔

پروفیسر ریاض الاسلام، "فکر و نظر" میں شائع اپنے مضمون "صوفیانہ ادب کے لئے ایک منہاجِ تحقیق کی ضرورت" میں جوامع الکلم مخطوطات برٹش میوزیم میں دی ہوئی خواجہ گیسو دراز کی فرمودہ ایک لطیف

بات بیان کرتے ہیں کہ خدا نے ایک زاہد کو خبردار کیا کہ وہ شہر پر آگ کا عذاب نازل کرنے والا ہے اور تمام شہر میں صرف ایک گھر محفوظ رہے گا اور وہ ایک فاحشہ عورت کا ہے۔ زاہد نے اس فاحشہ کے گھر جا کر پناہ حاصل کر لی۔ تمام اہلِ شہر جل کر راکھ ہو گئے اور زاہد بھی اپنے زُہد کے باوجود اس لیئے بچ سکا کہ اس نے رات اُس فاحشہ کے سایۂ حفاظت میں گزاری۔ بعد میں یہ راز کھُلا کہ پورے شہر میں صرف یہ فاحشہ تھی جس نے ایک زخمی کتے کی خبر گیری کی تھی۔ مقصود یہ کہ خدا کی ادنےٰ ترین مخلوق بھی ہمدردی اور رحم کی مستحق ہے اور یہ بھی کہ درد جانے بغیر زندگی بھر کا زُہد لائق تعزیر اور درد بٹائے تو عُمر بھر کا عصیاں بھی قابلِ درگزر!

ان مثالیہ قصّوں سے قطع نظر کر کے اس حقیقت نفس الامر کو بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے منسوب روایات کے وسیع ذخیرے اور "قصص الانبیاء" جیسی کتابوں میں درج انبیاء سے نسبت دیئے گئے واقعات میں "اصل زر" کی تلاش مولوی کے وجود میں رُوحِ الصاف و خدا ترسی کا سراغ لگانے کے مترادف ہے۔ روائت خواہ جبرئیل امیں ہی کی سند کیوں نہ رکھتی ہو۔ مقامِ ظن و تخمین سے بالا نہیں اور:-

ظن و تخمیں سے ہاتھ آتا نہیں آہوئے تاتاری!

بُعدِ زمانی، زیبِ داستان، ضعفِ حافظہ، خامیٔ کردار اور فہمِ نارسا ایسے عناصر اس میں لازماً شامل رہتے ہیں، کیسا ہی عالمِ بے بدل کیوں نہ ہو خطائے بشری سے کیونکر محفوظ رہ سکتا ہے!

ایک خوبی استاد بھول گئے، دوسری شاگرد کے ذہن سے اُتر سکتی ہے ـــــ اور پھر تقابلی کرامات میں تعلّی کی چاشنی آنا لازم ہے۔ ایک مرید کے پیر و مُرشد اگر ایک وقت میں ہر جگہ حاضر ناظر ہو سکتے ہیں تو دوسرے معتقد کے امام و مقتدا پہ کونسا "ویزے" کی پابندی ہے! لہٰذا آخرین کو جو توشۂ آخرت میسّر آتا ہے، وہ صرف اوّلین سے منسوب معجز نمایاں ہے، واقعہ کی صداقت سِرے سے مفقود یا بڑی حد تک مشکوک۔ مرورِ زمانہ سے سرِمو انحراف اجارہ دارانِ منبر و محراب کے نزدیک کُفر و ارتداد تک پہنچا دیتا ہے۔

لکریشس کا قول ہے:- "خوف نے خداؤں کے بنانے میں ماؤں کا کام کیا ہے"۔ بے شک ـــــ جذبۂ عقیدت کی شِدّت نے حاسۂ عقلی معطّل کر دیا۔ فہم و شعور کی جگہ کیف و سُرور نے لے لی، اندھی محبّت نے علم و ادراک پر غلبہ پا لیا، عاجز بندوں نے اپنے ہی جیسے بے اختیار بندوں کو الوہیت بخش دی اور ـــــ جوشِ الفت میں اپنے مرجعِ محبّت کی موت ہی سے انکار کر دیا اور جب تک زندہ خدا کے داہنے ہاتھ نہ بٹھا لیا محفوظ نہ سمجھا، مقبول خیال نہ کیا۔ مُردے پُوجے گئے، دادیوں کی رُوحیں پُوجی گئیں۔ ان توہمات کے زیرِ اثر کمزور انسان نے مذہبی بزرگوں کی پوجا شروع کر دی جو اب تک جاری ہے۔ انسان نے انسان

کو خدا بنا کر پوجا، بادشاہ بھی اسی بناء پر خدا بنے، بے عملی نے تصوّف میں پناہ لی، لوگ روٹی کپڑے سے فارغ ہو کر ماضی کی حسین یادوں میں کھو جاتے اور اسی طرح کی قیاس آرائیوں میں ڈوب جاتے تھے۔ جو مَن میں آتا کہہ دیتے کہ دیوتاؤں کا جواب اس بارے میں یہی ہے۔ لوگ ان کی اٹکل پر ایمان لے آتے۔ اور کبھی بھولے سے بھی شک نہ کرتے تھے۔ پھر یہ ہوتا تھا کہ ان کے افکار ہزاروں سال میراث بن کر چلتے تھے اور سخت بدنصیبی میں بھی قائم رہتے تھے ان کے خلاف کوئی لب ہلانے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ ادھر ہند میں "ہنو مان جی" کی قوت کا عالم یہ کہ ہزاروں سال پہلے سوا لاکھ ہاتھی دُم سے پکڑے اور گھما کر آسمان کی جانب پھینکے آج تک واپس نہ ہوئے۔ اور نہ مستقبل میں امید ہے۔

مسلمانوں پہ کب ادبار آیا۔ کہ جب تعلیمِ قرآن کو بھلایا، اہلِ اسلام لاکھ توحیدی سہی پھر بھی اسرائیلی اور تثلیثی روایات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان محیّر العقول کہانیوں کے سامنے خود کو کم تر خیال کرنے لگے۔ دینِ فطرت کی سادگی افسانوی دلکشی کے سامنے اُبھر نہ سکی۔ حقائق میں کہاں یہ دلفریبی! دوسروں کو "مائل بہ کرم" کرنے کے لئے کچھ تو رنگ آمیزی ہو۔ سوچا محض تقوے کی سختی، نماز کی خشکی اور روزوں کی گرمی سے تو غیروں کے دِل جیتنا مشکل ہے، لگے یہ بھی زمین آسمان کی ملانے ——— حقیقت خرافات میں کھو گئی ——— مسلمان اعجوبہ خیزیوں اور حیرت زائیوں میں کیوں پیچھے رہنے لگا۔ یہاں بھی قصّہ گویوں کی ایک جماعت پیدا ہو گئی۔ جن کا کام جھوٹی کہانیاں بنا بنا کر عوام النّاس کو خوش کرنا تھا۔ ان پیشہ ور قصّہ گوئیوں کو قصّاص کہا جاتا تھا۔

مسلمان، جناب جعفر ابنِ ابی طالبؓ کو تنہا نہیں ——— فرشتوں کے ساتھ آسمانوں میں لے اڑا۔ عامر بن فہیرہؓ کے جنازہ کو آسمان پر اٹھاتے دکھایا۔ خبیب بن عدیؓ کی نعش کو سُولی سے اتارا تو دفعتاً ایک دھما کا سنائی دیا، پیچھے مُڑ کر دیکھا تو نعش غائب، علا ابن حضرمیؓ نے غالباً فرشتوں کی امداد کی ضرورت محسوس نہیں کی: "عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصّہ تمام"، ہمّت دکھائی اور آسمان پر پہنچ گئے ——— حضرت ہارونؑ کے جنازہ کا آسمان پر اٹھایا جانا اور پھر ——— حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی دعا سے آسمان سے زمین پر اترنا مستدرک حاکم میں مفصّل مذکور ہے ——— آصف بن برخیاہ، ملکہ بلقیس کا تخت مہینوں کی مسافت سے پلک جھپکنے سے پہلے پہلے حضرت سلیمانؑ کی خدمت میں حاضر کر دیتے ہیں، ہُوا حضرت سلیمانؑ کے تخت کو جہاں چاہے اڑائے پھرتی ہے ——— اصحابِ کہف تین سو سال تک بغیر کھائے پیئے زندہ رہے ——— بنی اسرائیل کے ایک عابد و زاہد کا قصّہ روایات میں آیا ہے کہ لوگ اس کی تجہیز و تکفین میں مشغول تھے۔ اچانک ایک تخت آسمان سے اترتا نظر آیا۔ ایک شخص نے اس عابد کو اس تخت پر رکھ دیا، تخت اوپر اٹھتا گیا، لوگ دیکھتے رہے یہاں تک کہ وہ غائب ہو گیا ——— یہ عابد قسمت کا بڑا دھنی نکلا، ایسا آسمانی تخت مسیحؑ کو نصیب ہُوا نہ......

جناب رسالتمآبؐ کو۔ حیرت ہے آج کائناتِ ارضی میں ایک بھی عابد و زاہد نہیں ــــــ یا عابد مرتے نہیں۔

ان سب "غیر سرکاری کاروائیوں" کے متعلق بڑے حوصلے سے لکھا ہے کہ قانونِ فطرت کے خلاف ــــ نہ سنّت اللہ سے متصادم! بلکہ ایسی حالت میں سنت اللہ ہی قائم ہو جاتی ہے کہ اپنے خاص بندوں کو آسمان پر اٹھا لیا جائے۔ (حیاتِ عیسیٰ مولانا ادریس کاندھلوی صـ۱۲ تا صـ۲۲)

گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، مولانا موصوف کے نزدیک ابھی ایسی حالت میں سے نہ گزرے تھے کہ ان کا بھی اللہ کے خاص بندوں میں شمار ہو جاتا۔

پیر مہر علی شاہ گولڑوی کی "سیفِ چشتیائی" میں لکھا ہے:۔

> ہزاروں لوگ جو اپنے گھروں سے موت کے ڈر کے مارے نکلے اور کہا اللہ تعالیٰ نے ان کو مر جاؤ۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ کیا۔۔۔

پھر جلالین کے حوالے سے لکھا ہے:

> ۔۔۔ یہ لوگ زندہ ہونے کے بعد مدت دراز تک زندہ رہے لیکن ان پر موت کا اثر باقی رہا جو کپڑا کہ وہ پہنا کرتے تھے کفن کی طرح ہو جاتا تھا اور یہ حالت ان کی تمام قبائل میں باقی رہی۔۔۔۔

آگے لکھا ہے!

> اُن چوبیس سردارانِ قریش کو جو بدر کے کنوؤں میں پھینک دیئے گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے زندہ کر دیا۔

اسی کتاب میں درج ہے کہ علامہ سیوطی کفایۃ المعتقدین سے بروائت یافعی شیخ عمر بن فارض مکّی کا چشم دید واقعہ نقل کرتے ہیں۔

> شیخ عمر ایک ولی اللہ کے جنازہ پر جا پہنچے۔ نمازِ جنازہ ادا کر چکے تو کیا دیکھتے ہیں کہ اس قدر سبز جانور آسمان سے اترے ہیں کہ ان سے آسمان چھپ گیا۔ ان میں سے ایک بڑا جانور الگ نیچے اترا اور اس نے اس ولی اللہ کو اس طرح نگل لیا جیسے کہ جانور ایک دانہ نگل لیتا ہے، اور آسمان کی طرف اُڑ گیا۔"

قطب العالم سلطان العاشقین و برہان المعشوقین حضرت خواجہ محمد سلیمان تونسوی کا قصہ مشہور ہے کہ آپ کا خادم بارگاہ اپنی ہندو محبوبہ کے گھر میں بغرض ملاقات جا گھسا، ہندو نے پکڑنے کا ارادہ کیا تو کیا دیکھتے ہیں کہ اندر اس محبوبہ کا شوہر ہے خادم نہیں۔ اس واقعہ

سے ایک روز بعد قطب العالم نے خادم سے کہا کہ فلانے میں تمہارے لئے کب تک
فلاں ہندو بنوں گا میرے سفید بالوں سے حیا کر۔" (سیف چشتیائی۔ پیر مہر علی گولڑوی صہ ۲۰۲)

افاضات الیومیہ مولوی اشرف علی تھانوی بحوالہ "دیوبندی مذہب"، تحریر ہے کہ:۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی رح کو ایک مرتبہ بخار چڑھا ہوا تھا۔ نماز کا وقت
آگیا، آپ نے لکڑی پر نظر کی وہ بخار اس پر منتقل ہوگیا وہ کھڑی ہوئی کانپ رہی تھی۔" (صہ ۲۳۹)

الوالحسن علی بن عبداللہ ہاشمی لکھتے ہیں:

"انہوں نے ہندوستان کے ایک گاؤں میں سیاہ گلاب کا ایک بڑا پھول دیکھا جس پر
سفیدی سے ابوبکر صدیق رض عمر فاروق رض کے اضافہ سے کلمہ شریف لکھا ہوا تھا۔ تصدیق کے
لئے دوسرے غنچہ کو جو ابھی کھلا نہیں تھا توڑ کر دیکھا تو اس کے اندر بھی یہی لکھا تھا۔"
(ختمِ نبوت کامل۔ مفتی محمد شفیع دیوبندی صہ ۲۱۰)

اسی کتاب کے صہ ۲۸۷ پر لکھا ہے کہ

گوہ نے نہایت فصیح وبلیغ عربی زبان میں جس کو ساری مجلس سمجھتی تھی حضور نبی اکرم صلعم
کی صداقت اور خاتمیت کا اعلان کر دیا۔"

مسلمانوں کو اب تہی دستی وتنگ دامانی کا طعنہ دینا آسان نہیں، اب مسلمان "بفضلِ خدا" معجز بیانیوں میں خود کفیل ہوگیا ہے بلکہ اس کا دائرۂ عمل خشکی اور تری کے حیوانات تک وسیع ہوگیا ہے۔ مسلمانوں کے ہاں ہرن کو قوتِ گویائی نصیب ہوتی ہے، رُوحیں باتیں کرتی ہیں، جن مدد کرتے ہیں، تنگ کرتے ہیں، مہربان ہوں تو محبوب سے مِلا بھی دیتے ہیں۔

مولانا اشرف علی تھانوی نے حاجی امداداللہ کے ملفوظات "امدادالمشتاق" میں لکھا ہے کہ حضرت جنید بغدادی بیٹھے تھے کہ ایک کتا سامنے سے گزرا، آپ کی نگاہ اس پر پڑگئی، اس قدر صاحب کمال ہوگیا کہ شہر کے کتے اس کے پیچھے دوڑے۔ وہ ایک طرف بیٹھ گیا۔ سب کتوں نے اس کے گرد بیٹھ کر مراقبہ کیا۔
"کلام المرغوب" میں ہے کہ ایک جوانِ خرقہ پوش کی خاطر مچھلیاں ایک ایک جوہر منہ میں لئے سطحِ سمندر پر آگئیں ___ "فوائد السالکین" خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے ملفوظات پر مشتمل ہے اس میں کتوں کو پانی پر چلتے دکھایا گیا ہے ___ خواجہ معین الدین اجمیری کے ملفوظات "دلیل العارفین" میں لکھا ہے کہ ایک درویش قوالی سنتے سنتے زمین پر گر پڑے خرقہ ان کا زمین پر پڑا رہا اور جسم اس کے اندر سے غائب ہوگیا۔ ایک صاحبِ کشف بزرگ نے قبرستان میں دیکھا کہ ایک مُردے کو سخت عذاب کر رہے ہیں۔ وہ بزرگ نعرہ مار

گر گر پڑے اور مر گئے۔ ایک گھڑی بعد نمک کی طرح پانی بن کر غائب ہو گئے۔ "راحت القلوب"
حضرت خواجہ فریدالدّین گنج شکرؒ کے ملفوظات ہیں جنہیں خواجہ نظام الدّین اولیاءؒ نے مرتّب فرمایا۔ لکھا ہے:
امیر معاویہؓ یزید کو اپنے کندھے پر سوار کئے گزرے، رسولؐ اللہ نے تبسّم فرمایا کہ سبحان اللہ! "دوزخی بہشتی کے کندھے پر سوار ہے۔" حضرت علیؓ نے سنا تو دریافت کیا، یارسول اللہ! پسرِ معاویہ کیونکر دوزخی ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا' اے علی! یزید بدبخت وہ ہے جو میرے حسنؓ و حسینؓ اور ان کی تمام اولاد کو شہید کرا دے گا۔ (خیال رہے کہ یزید کی پیدائش ۲۶ ہجری ہے یعنی رسولؐ اللہ کی وفات کے سولہ سال بعد۔
اور سُنئے! ایک جوگی حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں آیا، آپ نے اس سے کہا کہ کوئی کرامت دکھاؤ۔ یہ سُن کر وہ ہوا میں اڑنے لگا۔ آپ نے اپنی جوتیاں ہُوا میں چھوڑ دیں' وہ اس جوگی کے سر سے اونچی چلی گئیں۔ آگے بڑھئے! لکھا ہے کہ جب خواجہ قطب الدّین چشتی کا انتقال ہُوا اور لوگوں نے جنازہ اٹھانا چاہا تو جنازہ خود بخود ہُوا میں معلّق ہو کر چلنے لگا۔ دفن کرنے کے بعد معلوم ہُوا کہ جنازہ کو فرشتے اٹھائے ہوئے تھے۔ "راحت المحبّین" ــــــ خواجہ نظام الدّین کے ملفوظات ہیں۔ امیر خسروؒ اس کے مرتّب ہیں۔ اس میں درج ہے کہ آدم علیہ السّلام کے رخساروں پر چڑیوں نے گھونسلے بنا لئے اور انہیں خبر تک نہ ہوئی۔ آدمؑ کے آنسوؤں سے زمین اس قدر تر ہو گئی کہ اس پر گھاس اُگ آئی اور اتنی بلند ہو گئی کہ آپ کا وجودِ مبارک اس میں پوشیدہ ہو گیا۔

"انفاس العارفین" شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ کی ایک بُلند پایہ تصنیف ہے۔ اس میں ہے فرشتے قبر کے قریب اترتے ہیں۔ تختِ آسمان پر اٹھتا ہے، کتّا صاف زبان میں السّلام علیکم کہتا ہے، چڑیا بتاتی ہے "کل عید ہے" جنگلی کوّا توحید کے بارے میں سوال پوچھتا ہے، محمد غوث کی چارپائی پریاں اٹھا کر لے جاتی ہیں!
"فتنۂ ابنِ سبا" میں معتقدین کے ایک خاص وسیع حلقے کے کانپوری واعظ و مولوی کی خوش اعتقادی کا ذکر ان الفاظ میں ملتا ہے۔ "مولوی صاحب ایک دن فرمانے لگے، مسجدِ حرام کا ایک معجزہ یہ بھی ہے کہ چاہے کتنے آدمی آجائیں، جگہ پُر نہیں ہوتی اور دوسرے یہ کہ بدّو پہاڑوں سے پتھر لاد کر لاتے ہیں وہ قدرتِ الٰہی سے تربوز بن جاتے ہیں،" لکھا ہے کہ اس بیان سے سامعین پر ایک کیفیّت طاری ہو گئی۔

ضعیف الاعتقادی، اوہام پرستی اور مخلوق پرستی بھی عجیب چیز ہے۔ جہلا ہی نہیں علماء بھی اس کے شکار ہیں، رسولِ خدا، عالم الغیب۔ مسیحؑ، ابن اللہ۔ حضرت علیؓ، مشکل کشا، اور اولیا، قاضی الحاجات۔ اسی جذبے کی دین ہے۔ دُنیا کی کثیر آبادی جس میں علماء، فلاسفر، سائنسدان، قانون دان" اور آئین سازوں کی بڑی تعداد ہے، مانتی ہے کہ خدا، یا، خدا کا بیٹا دنیا میں انسان کی شکل میں آیا۔ شرک کی دلفریبیاں اپنے پجاریوں کو

اسلام کے قریب نہیں آنے دیتیں۔ ہندو ارتقاء کے قائل۔ ان کا خدا مچھلی کی شکل میں آیا، پھر کچھوے، پھر خنزیر پھر شیر، پھر انسان کے بچے کی شکل میں، اس کے بعد نیم وحشی آدمی اور پھر ایک مہاتما کی شکل میں مگر رہا مجسم، ہندوؤں کے ہاں خدا کے لئے گھر نہ تھے بتوں کے لئے مندر تھے، مسلمانوں کے ہاں خدا کے گھر تھے، مندر نہ تھے لیکن انہوں نے آخر مندر بنا ہی لیئے ؎

آوارۂ غربت نہ تواں دید صنم را
خواہند دگر بُتکدہ سازند حرم را

سر آلیور لاج نے غلط نہیں کہا کہ لوگ بلا دلیل عقیدہ قائم کرنے کی کتنی زیادہ استعداد رکھتے ہیں۔ وہ جو ایک فرضی قبر کے سرہانے "شاہ صاحب" بیٹھے ہیں، اپنے معتقدین سے نہ ملنے کی شکائت نہیں کرتے۔ علمائے سلف و خلف کے آباد کردہ تصورات کے یہ وہ صنم کدے ہیں جہاں مملکتِ خداداد کا ہر توحیدی کسی نہ کسی شکل میں پرستش پر مجبور ہے۔

ازمنۂ قدیم کا جاہلِ مطلق ہو یا دورِ جدید کا عالمِ متقدر، روم و یونان کے دیو مالائی قصے ہوں یا بابل و نینوا کی من گھڑت کہانیاں، اسرائیلی خرافات ہوں یا عیسوی خرافات، عہد نامہ عتیق کی نیک روحیں ہوں یا عہد نامہ جدید کی بدروحیں، ہندوؤں کی ہنومانی داستانیں ہوں یا مسلمانوں کے قصص الانبیاء، تذکرۃ الاولیاء۔ سب ظالم وجاہل انسان کے عجزِ فہم کی تصویر، احساسِ برتری کی تخلیق اور اس کی عجوبہ پسندی کے تراشیدہ صنم ہیں۔ متقدمین سے متاخرین تک ایسی ہی حیرت زائیاں نظر آئیں گی "رفع الی السّماء" کا نظریہ فکر و نظر کی اسی مفلسی کا آئینہ دار ہے۔ اسلام کے نظامِ فکر و عمل میں یہ امپورٹڈ آئیٹم (IMPORTED ITEM) ہے جسے عیسائیت سے درآمد کیا گیا ہے۔

انبیاء کے مخالفین کا انبیاء سے استہزاء و استکراہ، محلِ تعجب نہ مقامِ تأسف:

یحسرۃ علی العباد ما یاتیھم من رسول الا کانوا بہ یستھزءون (یٰسین ۳۱)

"ہائے افسوس بندوں پر جب بھی ہماری طرف سے کوئی رسول ان کے پاس آیا یہ اس سے تمسخر ہی کرتے رہے۔"

رونا منکرین کا نہیں ماتم مومنین کا ہے جنھوں نے جوشِ مسابقت میں توقیرِ انبیاء کو تماشا بنا دیا۔ تحسینِ ناشناس کہیئے کہ ان روشن ضمیروں سے منسوب ہر غیر فطری غیر قرآنی واقعہ اس دلیل سے 'درج رجسٹر' کر لیا کہ کیا خدا ایسا کرنے پر قادر نہیں؟ (تفہیم القرآن جلد ۴۔ صـ۱۶۳) ——— اس دلیلِ بے ہمہ و باہمہ سے ہر مجوزہ بُت کی پرستش آسان ہو جاتی ہے۔ اب کس کا مُنہ ہے کہ کہے 'خدا قادر نہیں'!

اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ نادرہ سے انکار ممکن نہیں۔ لیکن قرآن سے ظاہر ہے کہ نیک بندوں

کو دشمنوں سے بچانے کا یہ طریقِ کار کہ انہیں آسمان پر اٹھالے، اللہ تعالیٰ ہی کے مقرر کردہ قانون کے خلاف ہے۔ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ۝ قَالَ فِيهَا تَحْيَوْنَ وَفِيهَا تَمُوتُونَ وَمِنْهَا تُخْرَجُونَ ۝ (اعراف ۲۵-۲۶)۔ خدا نے ارضِ خاک ہی انسانوں کا مسکن بتایا ہے، حضرت مسیحؑ بھی انسان تھے، خدا، نہ خدا کے بیٹے نہ فرشتے۔ فرمایا: أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ كِفَاتًا ۝ أَحْيَاءً وَأَمْوَاتًا۔ (مرسلات ۲۶-۲۷) کیا ہم نے زمین کو زندوں اور مُردوں کے لئے کافی نہیں بنایا کہ کسی کو آسمان پر لے جاکر بٹھانے کی ضرورت پیش آئے؟ اور پھر یہاں اللہ تعالیٰ کی قدرت زیرِ بحث نہیں واقعہ کی صداقت زیرِ نظر ہے۔ کسی اَمر میں اللہ کی قدرت کا ہونا اس بات کا ثبوت نہیں کہ واقعی وہ بات وقوع میں بھی آگئی۔ کیا خدا تعالیٰ اس بات پر قادر نہیں کہ نبی اکرمؐ کو زندہ کرکے دوبارہ دنیا میں لے آئے، تو کیا اس سے ثابت ہوگیا کہ حضورؐ زندہ ہوکر دُنیا میں آجائیں گے؟ اور کیا خدا تعالیٰ کی قدرت سے بعید ہے کہ مولوی انسان بن جائیں، پھر کیا وہ بَن گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی غارِ ثور میں اللہ تعالیٰ نے دشمنوں سے بچایا، سورۂ توبہ میں اس کا ذکر ہے وَأَيَّدَهُ بِجُنُودٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ (۴۰) کیا آنحضرت اس موقع پر آسمان کی جانب اٹھائے گئے تھے یا زمین ہی پر خدا تعالیٰ نے دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھا اور اپنی قدرت کا ثبوت دیا؟ اگر اللہ تعالیٰ کا ان بندگانِ عالی وقار سے حُسنِ سلوک کا عالم یہی رہا اور یہ سلسلہ کچھ دیر اور چلتا رہا تو نیک تو شاید زمین پر ایک بھی نہ رہے۔ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ (المدثر ۴۶)۔ قرآن ایسے بے حکمت لوگوں کو ڈرے ہوئے گدھے کہتا ہے: كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنفِرَةٌ (المدثر)

انبیاء سے منسوب قصص میں مافوق البشر معجز نمائیوں کے علاوہ ان کی کردارکشی کا پہلو بھی نمایاں ہے۔ "کتابِ مقدس" میں انبیاء کا دامنِ عصمت نفس پروری سے آلودہ دکھایا ہے۔ حالانکہ ان نابغۂ روزگار ہستیوں کے منصب کا تقاضا ہے کہ وہ حسنِ اخلاق کا اعلیٰ نمونہ ہوں:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

مذہبی پیشوا، قہرِ خدا کا، اس ستم پیشہ کے ہاتھوں کب کسی نبی کا تقدس برقرار رہا! ان میں سے بعض نے بے ہودہ قصّوں کو اپنی تفسیروں کی زینت بنایا۔ عظمت و عصمت انبیاء کے داعی اور آن و شانِ رسالت کے محافظ آج بھی ان قصّوں کو پڑھتے ہیں اور ذرا شرم محسوس نہیں کرتے، کوئی توجہ دلائے تو کہا سنا بخشوا کر آئے۔ بارے ان شرمناک داستانیں انبیاء علیہم السلام کا زہد و اتقاء سلامت رہے نہ رہے "واعظوں" کے اپنے "کاریگر" کیلئے کچھ گنجائش پیدا ہوجاتی ہے۔ انبیاء آخر انسان ہی تو تھے اور انسان ٹھہرا خطا کا پتلا۔ کعبے سے کفر کا ظہار ہو تو اپنا انکار بھی اسلام ہی دکھائی دیتا ہے، جُرم کچھ نرم سی حرکت لگتی ہے، گناہ کچھ خفیف سا الزام

معلوم ہوتا ہے۔ یوں ان جُبّہ پوش و عمامہ بردار علماء کو حوصلہ رہتا ہے کہ ذرا سی خطائے بشری ہی تو ہے!
ککڑی کے چور کو پھانسی کون دیتا ہے تا آنکہ اُخروی رعائت کا بھی ایک گوشہ نکل آتا ہے، کیا ہوا جو،

خوار ہیں، بدکار ہیں، ڈوبے ہوئے ذِلت میں ہیں

یہ سند کیا کم ہے!

کچھ بھی ہیں لیکن ترے محبوب کی امت میں ہیں

اور تو اور جب اللہ تعالےٰ کے فرشتے انسانی شکل میں آکر خرابی کر سکتے ہیں اور قومِ لوطؑ کے پاس فرشتے خوبصورت لڑکوں کی شکل میں جا سکتے ہیں (تفہیم القرآن جلد۱ صفحہ ۹۸) تو خطا کارانِ اُمت بیچارے کس شمار قطار میں! یہ الگ بات کہ فرشتوں میں سے کوئی آیا نہ گیا۔ قرآن کریم ملائکہ کے متعلق کہتا ہے:

لَمْ تَرَوْهَا (۹/۲۶)

"تم انہیں دیکھ نہیں سکتے"

اسرائیلی روایات تو یونہی بدنام ہیں۔ دَورِ حاضر کے مفسرِ قرآن کی، خیر سے "عہد ساز کتاب"، "تفہیم القرآن" میں اس طرح کا مالِ شراکت وافر مقدار میں مل جاتا ہے ـــ مالِ موذی نصیب غازی ـــ

حضرت لوط علیہ السلام کی قوم غیر فطری ذوق میں نمایاں تھی۔ أَئِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِنْ دُونِ النِّسَاءِ (اعراف ۸۲) ۲۷/۵۵-۵۴۔ چند حسین نوجوان حضرت لُوطؑ کے مہمان ہوئے ـــ تو ہوس مندوں کی نظر پڑ گئی۔ ان سے تقاضا کیا کہ ان نوجوانوں کو ان کے نفس کی تسکین کے لئے ان کے سپرد کر دیں۔ حضرت لوطؑ نے بقول علماء ان لڑکوں کے عوض اپنی بیٹیوں کی جانب اشارہ کیا (سیارہ ڈائجسٹ انبیاء کرام نمبر) کہ عوض معاوضہ گلہ ندارد! حیرت ہے اس پیش کش سے قومی عارضہ کا علاج کیونکر ممکن ہوا؟ قوم کی اس ابلتی ہوئی ہوس میں، قیاس ہے، طفلانِ نوخیز تو "شٹل کاک" بُرقع پہن کر نکلتے ہوں گے یا پھر آدمی بننے اور خطرہ ٹلنے تک گھروں میں محصور رہتے ہونگے، یہاں تک کہ خود قوم کے لئے خطرہ بن جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مفسرین نے یہاں اس طور کے معاملہ سے انکار کیا ہے اور لکھا ہے کہ اصل میں حضرت لوطؑ کا کسی اجنبی کو مہمان ٹھہرانا ان کے نزدیک قابلِ اعتراض تھا کیونکہ غیروں کو وہ اپنے لئے خطرہ سمجھتے تھے۔ حضرتِ لوطؑ نے جواب میں کہا کہ ان مہمانوں کی وجہ سے آپ کو تکلیف ہو تو وہ ذمہ دار ہیں اور پھر میری دو بیٹیاں تم ہی میں بیاہی ہوئی ہیں جو اس امر کی کافی ضمانت ہیں۔ علامہ پرویز مرحوم نے معانی کا ایک اور نورانی پہلو بیان کیا ہے، مگر ان کا حوصلہ ہے جنھیں اللہ تعالےٰ علم کے ساتھ حکمت بھی عطا کرتا ہے۔ فرماتے ہیں:ـــ

"یہاں بستی کی عورتوں کو بیٹیاں کہا ہے یعنی ان کی بیویاں جنھیں چھوڑ رکھا تھا۔
ایک مردِ بزرگ و پاکباز کے نزدیک بستی کی عورتیں بمنزلہ بیٹیوں کے ہوتی ہیں۔"
(جُوئے نُور صہ ۲۰۵)

حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو قرآن نے صِدِّيقًا نَّبِيًّا قرار دیا،
ع نقش ہے صفحۂ ہستی پہ صداقت ان کی

ناموسِ انبیاء کے پاسبان کس حوصلے سے ابوالانبیاء سے تین جھوٹ منسوب کرتے ہیں جبکہ وہ اپنے باپ سے منسوب شاید ایک بھی جھوٹ سننا گوارا نہ کریں۔ یہاں بھی خود جھوٹ بولنے کی گنجائش پیدا کی ہے۔ شاید اسی لئے جھوٹ دَورِ حاضر کے علماء کی پہچان بن گیا ہے، ایوانِ بالا میں بیٹھتے ہیں اور جھوٹ بولتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، اللہ تعالےٰ نے اس طبقے سے سچ بولنے کی توفیق ہی چھین لی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو آگ میں ڈالنا نمرود کے لئے مسئلہ بن گیا، ایک مردِ کار آمد و بزرگ سال کے مشورے پر نمرود نے بارہ کوس پر محیط سوگز اونچی چار دلواری بنا کر اس میں لکڑیاں جمع کر کے آگ لگانے کا حکم دیا۔ اب مسئلہ منجنیق کے ذریعے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو اٹھا کر آگ میں پھینکنا تھا۔ چار ہزار تندرست توانا آدمیوں کے جمِ غفیر سے بھی وہ منجنیق اُٹھ نہ سکی۔ پھر وہ اٹھی کیونکر! یہاں "سیّارہ ڈائجسٹ" انبیاء کرام نمبر، کے مرتّب کی بھی عقل جواب دے گئی۔ یہاں "قصص الانبیاء" کا مصنّف ہماری راہنمائی کرتا ہے اور وہ یہ کہ چالیس مرد عورت نے آپس میں زنا کیا تب کہیں جاکر "اللہ میاں نے برکت ڈالی" تو منجنیق اٹھائی جا سکی اور اس کے توسّط سے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو آگ میں پھینکا گیا۔ لیکن اس "سعیٔ مبارک" کے باوجود آگ اس مردِ خدا پر بے اثر ہوگئی۔ اس سے آگے قصص الانبیاء کے فاضل مصنّف کی سمجھ سوچ بھی جواب دے گئی۔ فاضل مصنّف بے چارہ کیا کرتا، ہر صحت مند ناظر کا یہی حشر ہوتا۔ تھوڑی سی تکلیف اور کی ہوتی چالیس اور دھندے سے لگائے ہوتے کیا عجب نمرود کی محنت ٹھکانے لگتی!

قرآن کے بیان پر اجارہ دارانِ اسلام گلہ مند، "مفہوم" پر شکوہ کناں، "مطالب" پر معترض لیکن "قصص الانبیاء" کی فیض رسانی جاری ہے۔ یہاں علماء خاموش، عوام ساکت، حکومت بے بس اور ہم:

ساحل سے تھوڑی دُور پر تڑپا کئے

قرآن سے پیار اور پھر اس کا اظہار آسان نہیں۔ "اس میں دو چار بڑے سخت مقام آتے ہیں" پیشوائیت کے اشارۂ ابرو سے ایوانِ حکومت پر استخارے کا واجب آنا کل بھی روا تھا۔ آج بھی ہے اور کل بھی رہے گا!

مستند کتابوں اور علمائے کرام کی قابلِ احترام تحریروں سے ترتیب دیئے ہوئے سیارہ ڈائجسٹ کے انبیاء کرام نمبر میں حضرت یوسفؑ کے بیان میں درج ایک واقعہ سُنئے!

"حضرت یعقوبؑ نے بھیڑیئے کے قریب جاکر پوچھا' کیا واقعی تُو نے میری آنکھوں کے نُور اور میرے لختِ جگر کو کھایا ہے؟ حضرت یوسف علیہ السّلام کے سوتیلے بھائی سمجھ رہے تھے کہ ان کا باپ محض اپنے بیٹے کی جدائی سے نڈھال ہوکر بھیڑیئے سے ہم کلام ہے لیکن وہ اس قادرِ مطلق کو بھول گئے تھے جو ہر شئے پر قادر ہے۔ بھیڑیئے کو قوتِ گویائی مل گئی۔ بھیڑیا حضرت یعقوبؑ سے یوں مخاطب ہُوا" اے خدا کے نبی! مجھے قادرِ مطلق کی قسم میں نے تمہارے یوسف کو نہیں کھایا کیونکہ نبیوں کا ماس ہم پر حرام ہے۔"

دَورِ حاضر کے بھیڑیوں پر یا تو کوئی الزام نہیں لگا کہ صفائی میں قوتِ گویائی عطا ہو یا پھر جُرم کا ارتکاب چھوڑ دیا ہے، ویسے علماء کے جیتے جی بھیڑیوں کو اب خونِ ناحق کی ضرورت باقی نہیں رہی، عجب کیا جو کل کلاں بھیڑیئے مولویوں کی خونخواری کے خلاف استغاثہ دائر کرنا شروع کردیں، دورِ حاضر کا مولوی تو شاید اپنی صفائی میں کچھ نہ کہہ سکے! وہ مُنہ بھی شاید اسی لئے چھپائے رکھتا ہے کہ یہ مُنہ دکھانے کے قابل نہیں ہے۔

آگے بڑھیئے!!

"ادھر اپنی بیوی زلیخا کے کردار سے شاہِ مصر رنجیدہ اور غمزدہ رہنے لگا اور دو سال بعد ہی انتقال کرگیا۔ مفسّرین لکھتے ہیں کہ زلیخا کا عقد حضرت یوسف علیہ السّلام سے ہُوا۔ جس میں دونوں کی مرضی شامل تھی۔ "قصص الانبیاء" کا مصنّف حضرت یوسفؑ کے زلیخا کی جانب مائل ہونے کا اقرار کرتا ہے۔ لکھتا ہے "البتہ عورت نے خواہش کی اور پھر اس نے بھی خواہش کی۔ (ص ۱۱۳)

ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر
اُس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا

سیارہ ڈائجسٹ میں لکھا ہے:۔

"بعض حاشیہ برداروں نے اس واقعہ کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا کہ زلیخا بوڑھی ہوگئی تھی اور اللہ تعالےٰ نے نکاح کے بعد اسے پھر سے جوان کردیا"۔

(سیارہ۔ انبیاء کرام نمبر ۲۸۸)

ان حاشیہ برداروں میں خیر سے حجۃ الاسلام والمسلمین امام غزالی بھی شامل ہیں۔ وہ سورہ یوسف کی تفسیر میں

رقمطراز ہیں:

"فرشتے نے آکے کہا، اے یوسف! اللہ تعالےٰ یہ فرماتا ہے "اگر وہ بڑھیا ہے تو ہم اسے لڑکی کردیں گے۔ حضرت جبرائیل کے چھوتے ہی زلیخا حسن وجمال میں اپنے زمانے میں سب سے زیادہ ہوگئی اور کنواری تو تھی ہی" (ص ۲۳۸)

خیال کے اظہار کو چھوڑیئے یہ بہار دیکھئے!! "زلیخا شاہ مصر کی بیوی بھی اور کنواری بھی" ہاتھ لا استاد کیوں کیسی کہی! لے آئے کوئی ڈھونڈ کے ارباب نظر کو۔ وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ط (۱۲/۵۳)۔ عزیز مصر کی بیوی نے کہا میں اپنے آپ کی پاکیزگی کا دعویٰ نہیں کرتی .....

"قصص الانبیاء" کا واقعہ نگار اللہ تعالےٰ کے برگزیدہ نبی حضرت داؤد علیہ السلام کی سیرت طیبہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے، سنئیے اور.....

حضرت داؤد علیہ السلام ایک بالا خانے پر چڑھ کر چاروں طرف بہت دیر تک دیکھتے رہے اسی باغ میں بطشا عفیفہ ننگی حوض میں نہاتی تھی۔ حضرت داؤد کی اچانک نظر اس پر جا پڑی۔ ایک روائت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤدؑ نے اسکو دیکھ کر بہت خواہش کی (عفیفہ کے لفظ پر غور کیجئے اس کے مقابل حضرت داؤدؑ کو کیا دکھایا ہے۔ حضرت داؤد نے اس کے شوہر اوریاہ کو بلایا اور اسے بہت روپیہ دے کر جہاد میں جانے کو تیار کر لیا جہاں سے وہ زندہ واپس نہ لوٹا۔ (اوریاہ کا کردار دیکھئے راہِ خدا میں جان دینے کے لئے تیار...) پھر داؤدؑ بطشا کو اپنے نکاح میں لائے اس طرح ان کی سو بیویاں ہوگئیں (ص ۲۶۸ - ۲۶۹) اوریاہ جناب داؤدؑ کی نمازیں پڑھیں حضرت داؤدؑ کا مصلےٰ پھاڑیں۔

ملاحظہ فرمایا' اصلاحِ خلق کے لئے خدا کے مقرر کردہ نبی نے سینچری پوری کرنے کے لئے کیا سیاسی جوڑ توڑ دکھائے۔ رازی کہتا ہے کہ حضرت علیؓ نے حکم دیا تھا کہ جو کوئی حضرت داؤد کا قصہ جیسا کہ قصہ گو بیان کرتے ہیں بیان کرے گا اس کو ساٹھ کوڑے لگائے جائیں گے یہ سزا اس سزا سے دوچند ہے جو ایک اتہام لگانے والے کو دی جاتی ہے۔

قصص الانبیاء کے محقق بے عدیل کی تحقیق کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام کی سات سو بیویاں ایک اور تین سو ایک، ان کے علیحدہ علیحدہ محلات تھے۔ آپ ہر شب اپنی بیوی کے پاس جاتے تھے۔ لکھا ہے پھر جماع بھی کرتے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ ملکہ بلقیس کی پنڈلیوں پر بال ہیں پھر

خبر ملی کہ مَیں۔ محقق نے نہایت دیانت داری سے دونوں خبریں درج کر دیں۔ آخری خبریں آنے تک مؤخر الذکر رپورٹ ہی درست سمجھی گئی۔ ازاں بعد بال اُڑانے کیلئے لوزہ نامی ایک شخص سے نسخۂ کیمیا تیار کرایا گیا پھر کہیں اسے نکاح میں لائے (ص ۲۹۴۔ ۳۰۵) ـــــ کیا کیا نہ کیا ہم نے صنم آپ کی خاطر!ـــــ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ قریب ترین زمانہ نہ ہوتا تو جوشِ عقیدت وشوقِ مسابقت میں آنحضورؐ کیلئے ڈیڑھ دو ہزار بیویوں کا انتظام کر دینا اس امت کے لئے کیا مشکل تھا۔ تیس مردوں کی قوت تو بخش ہی دی۔ (بخاری بحوالہ مقامِ حدیث از علامہ پرویز مرحوم)۔ تقلیدِ سلیمانی میں سات سَو سے زاید مردوں کی طاقت عطا کر دیتے تو ہم آپ کیا کر لیتے۔ حضرت سلیمانؑ پر حضورؐ کی فضیلت میں کس امتی کو شک ہے؟

آج تک اس فحش کتاب کے خلاف کوئی جلوس نکلا نہ احتجاجی جلسہ منعقد ہُوا۔ انتظامیہ حرکت میں آئی نہ وزیرِ مذہبی امور کو حیا آئی۔ یہ کتاب کھلے بندوں مارکیٹ میں بک رہی ہے جسے اس موضوع سے دلچسپی ہو جہاں سے جی چاہے خرید کر پڑھ لے ـــــ ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے!ـــــ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گزشتہ تمام انبیاء کی خوبیوں کے جامع ہیں۔ وہ انسانیت کا بہترین نمونہ اور ان کی تعلیمات مثالی ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ ۲۳ برس کے مختصر دورِ نبوت میں انہوں نے بدترین کو بہترین میں بدل دیا۔ آنحضرتؐ کی ذاتِ اقدس سے وابستہ شاندار انقلاب کے دائمی معجزے سے دنیا اس وقت تک فائدہ اٹھاتی رہے گی جب تک ان کی تعلیمات پر عمل جاری رہے گا۔ آپ کے عہدِ سعادت آثار کے واقعات تاریخ کا روشن باب ہیں اور بڑی حد تک محفوظ، یہاں کُھل کھیلنے کی گنجائش کم تھی۔ انتہائی حزم و احتیاط کے باوصف جیساکہ ابتداء میں ذکر ہو چکا ہے۔ روایات میں آنحضورؐ سے منسوب ایسی باتیں ملتی ہیں جن کی صداقت محلِ نظر ہے اور جو حضورؐ کی سیرتِ مبارکہ سے مطابقت نہیں رکھتیں اور تخفیفِ شان کا پہلو لئے ہیں۔ اکابرینِ امت نے بالعموم اور علامہ پرویز مرحوم نے بالخصوص اپنی متعدد تصانیف میں ایسی روایات کو موضوعِ گفتگو بنایا ہے۔

علماء کی تقریریں عموماً مدحتِ سرکارِ دو عالم ہی پر تو ختم ہوتی ہیں۔ نبی کی آن پر ہی تو کٹ مرنے کا عہد دہرایا جاتا ہے۔ تحفظِ عظمتِ رسالت ہی تو مقصود و مطلوبِ مومن بتایا جاتا ہے۔ پھر مقامِ تأسف ہے کہ توقیرِ نبوت کے پاسبانوں کو، توہینِ رسالت کی یہ وسیع نشر و اشاعت کیونکر گوارا ہے؟ کہاں ہیں وہ جن کے نام کے آگے لمبی لائن القابات کی لگی ہوتی ہے! وہ منبعٔ رشد و ہدایت، مصدرِ لطف و عنایت اور معدنِ جود و سخا کیا ہوئے! وہ ظلِ سبحانی اور واقفِ رموزِ حقانی، وہ اقطابِ دوراں و اغیاثِ زماں کہاں سو گئے؟ وہ علمِ شریعت کے ماہر کہاں ہیں، وہ وارثِ رسولِ امینؐ کے کہاں ہیں۔ اصولی کدھر ہیں مناظر کہاں ہیں؟ محدث کہاں ہیں مفسر کدھر ہیں؟ اَلَیْسَ مِنْکُمْ رَجُلٌ رَّشِیْدٌ (۱۱/۷۸)

ـــــ وہ جن کے ہوتے ہیں خورشید آستینوں میں ـــــ انہیں کہیں سے بلاؤ بڑا اندھیرا ہے ـــــ

بشیر احمد عابد ——— (ریاض سعودی عرب)

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا

انسانی زندگی کا نصب العین؟ ذات کی نشوونما!

(ایک پہلو)

"میری ذات پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑتا" یا "میری ذات کا اس سے کوئی تعلق نہیں"
یہ اور اس قسم کے دیگر جملے ہم ہر روز سنتے اور استعمال کرتے ہیں. لیکن کبھی یہ بھی سوچا، کہ یہ "ذات" ہوتی کیا شئے ہے؟ بظاہر اس کا جواب نہائت سادہ اور آسان ہے. بھلا کونسی ایسی شئے ہے، جو ہم سے تعلق رکھتی ہو اور ہم اس کے بارے میں سوچتے نہ ہوں! تاہم ذرا بھی سنجیدگی سے غور کیا جائے تو یہ تلخ حقیقت اُبھر کر سامنے آجائے گی کہ اپنے متعلق بہت کچھ جاننے کے باوجود ہمیں اپنی "ذات" کے متعلق کچھ بھی علم نہیں! یہ بات جو میں اتنے وثوق سے کہہ رہا ہوں، اس کی وضاحت تو ذرا آگے چل کر کروں گا، پہلے یہ دیکھ لیجئے کہ اگر ہمیں اپنی ذات اور اس کی اہمیت کا تھوڑا سا بھی احساس ہو، تو یہ ہم کبھی نہ کہیں کہ ہمارے کسی قول یا فعل کا ہماری ذات پر کچھ اثر نہیں پڑتا! ایسا کہنا "اپنی ذات" سے ہماری لاعلمی کی پہلی دلیل ہے.
انسانی ذات اور اس کی اہمیت سے متعلق علم، وحیٔ خداوندی سے تعلق رکھتا ہے. اگر یہ علم وحیٔ خداوندی کے ذریعے عطا نہ ہوتا، تو انسان کیلئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ تنہا اپنی عقل کی بدولت "انسانی ذات" کی کنہ وحقیقت کو معلوم کرسکتا. یہ علم نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے نوعِ انسان تک پہنچا دیا گیا ہے. آپؐ کے منصب رسالت کا ایک فریضہ یہ بھی تھا کہ کتاب وحکمت کے مطابق لوگوں کی ذات کی نشوونما کریں. وَيُزَكِّيكُمْ [1]

---

[1] یزکیکم (۲:۱۵۱) اس لفظ کا مادہ (ز.ک.و) ہے جس کے بنیادی معنی. نشوونما پانا. بڑھنا. پھولنا پھلنا

(بقیہ فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر!)

آپ کے بعد ہمیشہ کی طرح، اگرچہ تاریخ کے بے رحم ہاتھوں نے اس کے آگے پردے تان دیئے، تاہم یہ علم اب بھی اپنی خالص حالت میں قرآنِ کریم میں محفوظ ہے۔ لہٰذا، ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ انسانی عقل کبھی اس قابل نہیں ہوگی کہ وہ ان پردوں کو اٹھا کر حقیقت تک پہنچ سکے، لیکن یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے۔ کہ جب تک ایسا نہیں ہوگا۔ انسانی ذات کی کنہ وحقیقت آشکارا نہیں ہوگی۔ اس ضمن میں تنہا عقلِ انسانی کوئی رہنمائی نہیں کر سکتی۔

انسانی ذات کی کنہ وحقیقت معلوم کرنا ہمیشہ سے دلچسپی کا باعث رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تاریخ کا کوئی دور ایسا نہیں گذرا ہے۔ جس میں انسان اپنی ذات کے وجود سے ناآشنا رہا ہو۔ ذات سے وابستہ کوئی نہ کوئی عقیدہ یا تصور ہمیشہ قائم رہا ہے۔ لیکن بغیر وحی کی راہنمائی کے یہ سب غلط یا باطل رہے ہیں۔ آج بھی صورتِ حال یہی ہے۔ انسانی ذات سے متعلق جتنے عقائد ہیں سب باطل بنیادوں پر استوار ہیں، اور ان میں سے کوئی بھی انسان کو صحیح سمت کی طرف نہیں لے جا رہا۔ اگر انسان کو اپنی ذات کے متعلق صحیح صحیح علم ہوتا تو یہ اپنے مالی اور جانی نفع ونقصان کا بھی پورا پورا خیال رکھتا اور اسی قدر محتاط رہتا۔ ہمیں جہاں کہیں ذرا سا نفع بھی نظر آئے، لپک کر جاتے ہیں اور اگر نقصان کا شائبہ تک بھی ہو، آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ ایسی کیفیت نفع ونقصان کے صحیح شعور سے پیدا ہوتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ذات کے نفع ونقصان کا ہمیں قطعی شعور نہیں ہے۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، انسان کو اپنی ذات کا صحیح شعور، وحی کی روشنی سے ہوتا ہے۔ جب تک یہ علم اس کی نگاہوں کے سامنے رہا، اس نے ذات کے نفع ونقصان کو ہمیشہ مقدم رکھا، اس حد تک کہ بعض اوقات ذات کی حفاظت میں موت کو بھی ہنس کر گلے لگا لیا! لیکن جب سے علمِ خداوندی اس کی آنکھوں سے اوجھل ہوا۔ جان دینا تو ایک طرف، یہ جان کے کسی ادنیٰ تقاضے کی خاطر پوری "ذات" کو قربان کر دیتا ہے۔ جب ہمیں کوئی جسمانی تقاضا تڑپائے۔ جیسے بھوک، تو پھر ہم نہیں دیکھتے کہ یہ کھیت میرا نہیں! ایک بیل کی طرح جو کھیت سامنے آئے مزے سے گھس کر چر چگ لیتے ہیں۔ اس دوران قطعی احساس نہیں ہوتا کہ اس حرکت کا ہماری ذات پر کیا اثر پڑے گا؟ بھوک کی تسکین تو پھر بھی کبھی جائز قرار پا سکتی ہے۔ جب شدت

ہیں۔ اس کے معنی پاکیزگی کے بھی آتے ہیں، لیکن یہ اس کے بنیادی معنی نہیں۔ خود قرآن کریم میں (ایک ہی آیت میں) ازکیٰ اور اطہر کے الفاظ الگ الگ آئے ہیں۔ (۲ : ۲۳۲) اس میں اطہر تو پاکیزگی کیلئے ہے اور ازکیٰ نشوونما کیلئے۔ پاکیزگی (طہارت) ایک سلبی صفت ہے یعنی نقائص اور خرابیوں سے دور رہنا۔ لیکن ازکیٰ ایجابی صفت ہے۔ (POSITIVE VIRTUE) یعنی بڑھنا، نشوونما اور بالیدگی حاصل کرنا۔ (تاج ۔ القرطبین)

اختیار کر جائے! ہم تو اکثر بلا وجہ دوسروں کے کھیتوں میں گھس جاتے ہیں۔ اور یہ سب اس لئے ہوتا ہے کہ ہمیں اپنی ذات کے نفع و نقصان کا علم نہیں ہے۔ ہماری یہ لاعلمی اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ اب جب کبھی ہم ذات کے نفع و نقصان کی بات کرتے ہیں تو اس سے بھی مراد، مالی یا جانی نفع و نقصان ہوتا ہے۔

انسانی ذات کیا ہے؟ اجمالاً یوں سمجھئے کہ یہ جو ہم ہمہ وقت "میں" "میں" کی رٹ لگائے رکھتے ہیں۔ دراصل یہی انسانی ذات ہے۔ ہر انسان کو خدا کی طرف سے دو نعمتیں عطا ہوئی ہیں۔ ایک جسم اور دوسری اس کی ذات۔ جسم کے اعتبار سے ایک انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں ہوتا ہے۔ اس کی نشو و نما کیلئے دونوں کے تقاضے اور خصلتیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ انسان کو جو چیز ممتاز اور ممیّز کرتی ہے وہ اس کی ذات ہوتی ہے۔ حیوان کے پاس "ذات" نہیں ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم نے اس فرق کو نہائت بلیغ انداز میں واضح کیا ہے۔ سورۃ المؤمنون میں پہلے اُن تمام مراحل کا ذکر کیا گیا ہے، جن سے عام حیوانات کے بچّے اور انسانی جنین رحمِ مادر میں گذرتے ہیں۔ مثلاً نطفے کا لوتھڑے (عَلَقَۃ) میں تبدیل ہونا، لوتھڑے کا گوشت کے ٹکڑے (مُضغۃ) کی شکل اختیار کرنا، پھر اس میں ہڈیاں (عِظٰمًا) بننا، پھر ہڈیوں پر گوشت کا پردہ چڑھنا۔ یہ وہ مراحل ہیں جن میں سے حیوانی اور انسانی جنین ایک ہی انداز سے گذرتے ہیں۔ اس کے بعد انسانی جنین کے متعلق کہا کہ ــ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ط (۱۶ : ۲۳) "پھر ہم نے اسے ایک جداگانہ قسم کی مخلوق بنا دیا" گویا اس مقام میں پہنچ کر انسان دیگر حیوانات سے یکسر مختلف ہو جاتا ہے۔ یہ مابہ الامتیاز تبدیلی بجز اس کے کہ کچھ نہیں کہ انسان کو جسم کے علاوہ "ذات" بھی عطا کر دی جاتی ہے۔ قرآنِ کریم نے انسانی ذات کیلئے "نفس"[۲] کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

سورۃ الزمر میں ہے:۔

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (۳۹ : ۴۲)

"خدا انسانی نفس کو نیند کی حالت میں، اور موت کی حالت میں، اپنے قبضے میں کر لیتا ہے۔ نیند کے بعد جب انسان بیدار ہو جاتا ہے، تو یہ نفس ایک مدّت تک کیلئے لوٹا دیا جاتا ہے۔ لیکن موت کی صورت میں وہ (انسانی جسم کی طرف لوٹ کر نہیں آتا۔) روک لیا جاتا ہے۔ اس میں ان لوگوں کیلئے جو غور و فکر

۲ے یہ لفظ متعدد معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے کوئی شخص یا جان۔ خود یا "اپنے آپ"۔ "اپنے لوگ" "بھائی بند"، ہم جنس۔ اوّلین جرثومۂ حیات۔ وغیرہ۔ لیکن اس لفظ کے اہم معانی وہ ہیں جسے ہم انسانی ذات یا خودی یا شخصیت کہتے ہیں۔

سے کام لیں ایک عظیم حقیقت تک پہنچنے کی نشانیاں مضمر ہیں ؟"

اس آیۂ کریمہ میں یہ عمیق حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ انسان اس کے طبعی جسم سے ہی عبارت نہیں۔ اس میں جسم کے علاوہ ایک اور شئے بھی ہے جسے انسانی ذات کہتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ بقاصرف انسانی ذات کو حاصل ہے۔ انسانی ذات کے متعلق، انسانی عقل نے مختلف تفاصیل پیش کی ہیں حافظہ (MEMORY) عقل (INTELLECT) شعور (CONSCIOUSNESS) قلب (MIND or PSYCHE) رُوح (SPIRIT or SOUL) سبھی اس کے متبادل تصورات ہیں۔ لیکن قرآنِ کریم کے مطابق ان میں سے ایک بھی اس کی صحیح تعبیر نہیں کرتا ہے۔ "زندگی" کی طرح یہ ایک منفرد مظاہر (PHENOMENON) ہے۔ جسے ہم صرف اس کی خصوصیات سے پہچان سکتے ہیں۔ کوئی انسان یہ نہیں بتا سکتا کہ زندگی کیا ہے؟ اس لئے کہ یہ کوئی مادی چیز نہیں۔ ہم اس کی علامات سے زندہ اور مردہ میں تمیز کر سکتے ہیں۔ یہی کیفیت انسانی ذات کی بھی ہے۔ بلکہ اس سے بھی لطیف تر۔ ہم دیکھ چکے ہیں، کہ خدا نے انسانی ذات کو "جدید یا منفرد تخلیق" سے تعبیر کیا ہے، اور اس کی انفرادیت کی وجہ یہ بتائی ہے کہ۔ وَنَفَخَ فِيهِ مِن رُّوحِهِ (۹: ۳۲) "اللہ نے اس میں اپنی روح (توانائی) پھونک دی" روحِ انسانی ذات کیلئے وہی کام کرتی ہے جو کام انسانی جسم کیلئے "حرکت" سرانجام دیتی ہے۔ یعنی نشوونما۔ ہر انسان کو جسم اور ذات، دونوں غیر نشوونما یافتہ شکل میں ملتے ہیں۔ ان دونوں میں کیا امکانی (POTENTIAL) صلاحیتیں ہوتی ہیں جنہوں نے نشوونما پا کر تکمیل کو پہنچنا ہوتا ہے۔ موجودہ دَور میں علم نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ "زندگی" جیسے ہی انسانی پیکر میں قدم رکھتی ہے، اس پیکر کی جسمانی نشوونما کا لمحہ بہ لمحہ پتہ چلتا رہتا ہے۔ لیکن جہاں تک انسانی ذات کی نشوونما کا تعلق ہے تو اس بارے میں ابھی تک علم لامحدود ہے اور متعین طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم اس حقیقت کو ثابت کرنے کیلئے کافی دلائل موجود ہیں، کہ جیسے ہی زندگی شعور سے آگاہ ہوتی ہے، انسانی ذات کی نشوونما پر اثرات مرتب ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ زندگی نے اپنا سفر کہاں سے شروع کیا اور یہ سفر کہاں پر ختم ہوگا، اس کے بارے میں ہمیں آج تک کچھ علم نہیں۔ قرآنِ کریم اس کی ازل اور ابد کو علم الغیب کہتا ہے۔ اور ہم اس پر ایمان لانے کے مکلف ہیں۔ زندگی کی تخلیق خدا کے "عالمِ امر" سے ہے اور محسوسات میں گھرا، ذہنِ انسانی ماورائے محسوسات (عالمِ امر) کی کنہ و حقیقت کا ادراک ہی نہیں کر سکتا ہے۔ بہر حال، ہمیں زندگی کی ابتدا اور انتہا کا علم ہو یا نہ ہو، قرآنِ کریم سے یہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ زندگی ایک ایسے تسلسل کا نام ہے، جو کم از کم انسانی پیکر میں آنے کے بعد کبھی نہیں ٹوٹے گا۔ موت کے بعد یہ جس مقام پر بھی پہنچے گی، اسے دوام حاصل ہو جائے گا۔ قرآنِ کریم کی اصطلاح میں خواہ یہ جنت ہو یا جہنم، دونوں میں کیفیت یہ ہوگی۔ خٰلِدِينَ فِيهَا أَبَدًا

اس ضمن میں، قرآنِ کریم سے دوسری اہم حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ انسانی جسم، خواہ کتنا نشوونما کیوں نہ پالے

موت سے اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ زندگی کا مزید سفر صرف اور صرف انسانی ذات کی نشوونما کی بنا پر ہوگا۔ جو ذات غیر نشوونما یافتہ ہوگی، قرآنِ کریم کے مطابق، اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ[۳]۔ وہ لوگ مزید آگے بڑھنے سے روک دیئے جائیں گے۔ اس مقام پر انہیں جو ماحول اور سامانِ نشوونما حاصل ہوگا، اس سے ان کی رہی سہی صلاحیتیں بھی خاکستر ہو جائیں گی۔ اسی بنا پر ان لوگوں کو اَصْحٰبُ النَّار بھی کہا گیا ہے۔ وَهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۔ اس حالت میں یہ لوگ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اس کے برعکس نشوونما یافتہ ذات کے لئے جنت کا مقام ہے:

جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا۔ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى (۲۰:۷۶)

"نشوونما یافتہ ذات کی جزاء" اس مقام کی خوبی یہ بتائی گئی ہے کہ یہاں ایسا ماحول اور ذرائع نشوونما دستیاب ہونگے کہ جن سے انسانی ذات مزید نشوونما پاکر اس سے بھی اعلیٰ وارفع مقام کی طرف اپنا سفر شروع کر دیگی۔ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ.... (۶۶:۸)

ان تصریحات سے، یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ انسانی زندگی کا مطلوب ومقصود ۔۔۔ ذات کی نشوونما ہے۔ جسم اور اس کی نشوونما اسی حد تک اہم ہے جہاں تک کہ یہ ذات کی نشوونما میں ممد ومعاون ہو۔ انسان کا جسم دراصل ذات کی نشوونما کے لئے ایک ڈھانچے کا کام دیتا ہے۔ ان کا باہمی تعلق یوں سمجھئے جیسے سیپ کے مُنہ میں قطرۂ نیسان۔ سیپ کی حفاظت اور پرورش اسی وقت تک اہمیت رکھتی ہے جب تک کہ یہ قطرہ، نشوونما پاکر موتی نہیں بن جاتا۔ جیسے ہی موتی بنا، سیپ کو کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ خوبصورت مثال پٹڑی کی دی جاسکتی ہے۔ یہ جس قدر سیدھی، متوازن اور مضبوط ہوتی ہے، سفر اسی قدر خوشگوار ہوتا ہے۔ انسانی جسم انسانی ذات کیلئے نہ صرف ایک پٹڑی کا کام دیتا ہے، بلکہ اسے ایک سمت بھی عطا کرتا ہے۔ اگر یہ سمت صحیح منزل کی طرف ہو

---

۳ جحیم: مادہ (ج۔ح۔م)۔ بنیادی معنیٰ روک دینا۔ جیسے جَحَمَ الْبَعِيْد۔ اونٹ کے مُنہ پر ایسا چھینکا چڑھا دینا جس سے وہ کاٹنے سے رُک جائے۔ قرآنِ کریم کے مطابق جحیم انسانی زندگی کی وہ منزل ہے جس میں وہ آگے بڑھنے سے رُک جائے اور چونکہ اس رُک جانے کا احساس شدید ہوگا، اس لئے اس سے انسان کے دل میں ایسی آگ بھڑک اٹھے گی (۱۰۴/۸) جو اس کی امیدوں کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دے گی۔ (لغات القرآن)

تو پھر بیچ میں سے اگر جسم ضائع بھی ہو جائے تو انسانی ذات کی نشوونما جاری رہتی ہے۔ اس لئے کہا۔ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ۔ جو لوگ سبیل اللہ[1] میں جان دیدیں انہیں مُردہ مت سمجھو بَلْ اَحْيَآءٌ۔ ہمارے قانون میں زندگی اور موت جسم سے وابستہ نہیں۔ ہمارے نزدیک اصل چیز ذات کی نشوونما ہے، اور جہاں تک ان لوگوں کی ذات کی نشوونما کا تعلق ہے تو اس کے لئے انہیں ہماری بارگاہ سے سامانِ نشوونما بدستور مل رہا ہے۔ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۙ (۳:۱۶۸) اس حقیقت کو ایک دوسرے مقام پر مزید وضاحت سے پیش کیا، جہاں کہا کہ ہمارے راستے میں جدوجہد کرنے سے تو ذات کی نشوونما ہو ہی جاتی ہے، اگر اس راستے پر کوئی قدم بھی رکھ لے تو اس کی ذات کی نشوونما ہمارے ذمے واجب ہو جاتی ہے۔ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ[2] ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ۔ یقین رکھو، انسانی ذات کی حفاظت اور نشوونما کے معاملے میں ہمارا قانون نہایت محکم ہے۔ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا[3] (۴:۱۰۰)۔ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں بیّن اور محسوس مثالیں دیتے ہوئے سورۃ الشمس میں فرمایا۔ (وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ۙ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ۙ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا ۙ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا ۙ وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا ۙ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا ۙ) سامانِ نشوونما کے یہ وافر ذخائر اور انہیں کنٹرول کرنے والے قوانین کی محکمیت۔ (وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا) خود انسانی ذات اور اس کے تقاضے، یعنی یہ خوبی کہ یہ نشوونما پاکر مستحکم بھی ہو سکتی ہے اور بغیر اس کے ٹوٹ کر بکھر بھی سکتی ہے۔

۱ے سبیل اللہ:۔ خدا کا تجویز کردہ راستہ جو انسانوں کو ان کی منزل مقصود تک پہنچا دے۔ اس منزل تک ایک فرد اس نظام کے اندر رہتے ہوئے پہنچ سکتا ہے، جو قوانینِ خداوندی کو نافذ کرنے کیلئے متشکل ہوتا ہے۔ اس لئے سبیل اللہ کے معنی خود نظامِ خداوندی کے بھی ہوں گے۔ انفاق فی سبیل اللہ سے مراد اس نظام کے قیام کے لئے خرچ کرنا اور قتال فی سبیل اللہ سے مراد اس مقصد کیلئے جنگ کرنا ہوگا۔ نظامِ خداوندی سے مقصود نوعِ انسان کی بہبود و ارتقاء ہے۔

۲ے اللہ و رسول: نظامِ خداوندی کی جامع اصطلاح: وہ نظام جو قوانینِ خداوندی پر مبنی، رسول کے ہاتھوں متشکل ہو۔

۳ے غفور: مادہ (غ۔ف۔ر) بنیادی معنی چھپانا۔ پردہ ڈالنا۔ محفوظ کر دینا۔ جیسے اَلْمِغْفَرُ، آہنی خود یا حلقہ
رحیم: مادہ (ر۔ح۔م) رِحْمٌ: بطنِ عورت کا وہ خانہ جس میں بچہ پرورش پاتا ہے۔ رَحْمَةٌ: وہ عطیہ جو کسی کی ظاہر و باطن کمی کو پورا کر دے۔ لہٰذا رحمت و سامانِ نشوونما ہے جو خدا کی طرف سے بلا معاوضہ ملتا ہے۔ (لغات القرآن)

(فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا) کیا یہ سب اس حقیقتِ کبریٰ کی شہادت نہیں کہ ہماری ساری سٹریٹجی (STRATEGY) کا مطلوب و مقصود انسانی ذات کی نشوونما ہے۔ اگر پہلے غافل رہے ہو تو اب اپنی جملہ کاوشوں کا نتیجہ کان کھول کر سن لو۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا۔ جس کسی نے بھی اس کی نشوونما کرلی وہ کامیاب ہوگیا۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا۔ اور جس نے اسے دبائے رکھا وہ سمجھ لے کہ، تباہ و برباد ہوگیا۔ (۱۰۔۱ : ۹۱)۔

ان حقائق کو جان لینے کے بعد کہ انسان کی ایک "ذات" ہوتی ہے، اور یہ کہ ہر ذات کی کچھ خصوصیات[1] ہوتی ہیں جو اس میں امکانی یا غیر نشوونما یافتہ حالت میں پائی جاتی ہیں۔ انسانی زندگی کا مطلوب و مقصود یہ ہے کہ ان خصوصیات کو نشوونما دی جائے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا طریقِ کار کیا ہے؟ نبی اکرمؐ کی بعثت کے وقت معاشرے میں انسانی ذات کی نشوونما (تزکیۂ نفس) کے سلسلے میں جو عقائد اور طور طریقے پائے جاتے تھے ان کے متعلق کہا۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ۔ اے رسولؐ! یہ لوگ جس طرح اپنی ذات کو نشوونما دے رہے ہیں، کیا کبھی تو نے اس پر بھی غور کیا ہے۔ ہمارے نام پر کچھ رسومات ادا کر کے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اس سے ان کی ذات کی نشوونما ہو رہی ہے۔ انہیں بتاؤ کہ ذات کی نشوونما یوں نہیں ہُوا کرتی۔ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تم میں انسانی اوصاف اور صلاحیتیں پیدا ہوں اور نشوونما پائیں تو اس کیلئے خدا نے اصول و قوانین مقرر کر رکھے ہیں۔ ان قوانین کے علاوہ تم جو طریقہ بھی اختیار کرو گے اس سے نہ تم میں انسانی اوصاف پیدا ہوں گے اور نہ ہی تمہاری ذات کی نشوونما ہوگی۔ یہ خوبی صرف خدا کے قوانین میں ہے کہ ان کی اطاعت سے انسانی صفات بھی پیدا ہوتی ہیں اور پھر ان کی نشوونما بھی ہوتی رہتی ہے۔ ان قوانین کے تابع تمہارا ہر عمل بار آور ہوتا ہے اور اس میں ذرہ برابر کمی نہیں کی جاتی۔ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا (۴۹ : ۴)۔ ذات کی نشوونما کا صحیح طریقِ کار یہ ہے۔ یعنی قوانینِ خداوندی کی اطاعت!

سورۃ بقرہ میں انسانی زندگی کے جملہ اہم قوانین بیان کرنے کے بعد، سب سے آخری آیات میں فرمایا۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا

ہمارے ان سب اصول و قوانین کا مطلوب و مقصود یہ ہے کہ تمہاری ذات میں وسعتیں پیدا ہوں اس لئے کہ یہ صرف ہم ہی جانتے ہیں کہ تمہارے ہر عمل کا اثر تمہاری ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ۔ لہٰذا اگر یہ اعمال قوانین کے دائرے کے اندر ہوں گے تو تمہاری ذات بھرپور نشوونما

---

[1] ذات کی خصوصیات: مومنین کی وہ تمام صفات، جو قرآنِ کریم میں مذکور ہیں۔ مثلاً۔ صابرین۔ صادقین۔ قٰنتین منفقین۔ مستغفرین اور متقین۔ وغیرہ۔

یافتہ ہوگی۔ ایک بیج اگر یونہی پڑا رہے، یا حرکت بھی کیوں نہ کرے، یہ کبھی پھل نہیں لا سکتا۔ لیکن جونہی یہ اپنے آپ کو ہمارے قوانین کے سپرد کرتا ہے تو اس کے ایک ایک دانے سے سات، سات خوشے اور ہر خوشے میں سَو، سَو دانے بھر جاتے ہیں۔ اس لئے تمہارے دل میں ہمیشہ یہ تڑپ رہنی چاہیئے کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے (رَبَّنَا) اگر ان قوانین کی اطاعت اور بجاآوری میں ہم سے کوئی بھول چوک یا خطا ہو جائے تو یہ چیز ہماری نشوونما کے راستے میں حائل نہ ہو۔ (لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا)۔ اے ہمارے نشوونما دینے والے (رَبَّنَا) دیکھنا کہیں ہم جہالت اور استبداد کے اس بوجھ تلے نہ دب جائیں، جن کے نیچے اقوامِ سابقہ دب گئی تھیں۔ (وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا) اور نہ ہی ایسی ذمہ داریاں عائد کرنا جس کے ہم متحمل نہ ہو سکیں۔ (وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ)۔ ہماری لغزشوں سے درگذر کرنا (وَاعْفُ عَنَّا) تمام تخریبی عناصر سے محفوظ رکھنا (وَاغْفِرْ لَنَا) ہماری نشوونما کیلئے ضروری سامان دیتے رہنا۔ (وَارْحَمْنَا) اس لئے کہ ہم نے تیرے قوانین کا سہارا لیا ہے اور تجھے اپنا سرپرست اور کارساز تسلیم کیا ہے (اَنْتَ مَوْلٰىنَا)۔ لہٰذا تمام باطل نظامہائے زندگی پر ہماری نصرت فرمانا (فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ)

یہ بات کہ انسانی ذات کی نشوونما قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے ہوتی ہے۔ اسے اس مثال سے سمجھئے، خدا کا قانون ہے کہ جھوٹ نہ بولا کرو۔ ہمیشہ سچی اور دوٹوک بات کیا کرو (قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا) ایک انسان کو دن میں کئی بار سچ اور جھوٹ کا سامنا ہوتا ہے۔ اب وہ جتنی بار جھوٹ کا گلا گھونٹے گا۔ اس میں سچائی کی صفت اتنی ہی نشوونما پائے گی۔ وہ حق بات کہنے کا خوگر ہو جائے گا۔ اور اس میں یہ بے باکی اور دلیری اس قدر پختہ ہو جائیگی کہ اگر اسے حق بات کہنے کی خاطر جان بھی دینی پڑے تو وہ دریغ نہیں کرے گا۔ سچ اور جھوٹ کی تمیز انسانی ذات کی بہت سی صفات میں سے ایک ہے۔ صرف اس ایک صفت کی پختگی کی یہ حالت ہے کہ انسان جان دینے سے بھی نہیں ٹلتا۔ جب اس کی ذات کی ساری صفات اسی نہج پر نشوونما یافتہ ہوں تو سوچئے! جب وہ جان دیگر آگے پہنچے گا تو اسے فرشتے کیونکر یہ نہیں کہیں گے:

اَهْلًا، وَسَهْلًا — يَا مَرْحَبًا!

اس کے برعکس، ایک ایسی شخصیت کو لیجیئے جس کے نزدیک سچ اور جھوٹ کا معیار قانونِ خداوندی نہیں بلکہ مالی و جانی منفعت ہو، نفع دیکھا سچ بول دیا! نفع دیکھا جھوٹ بول دیا! ایسا شخص حق کی خاطر جان دینا تو ایک طرف معمولی سا نقصان بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ قدم قدم پر قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی سے اسکی ذات مسخ ہو کر رہ جاتی ہے۔ ایسا شخص گو کہ اپنی اس پالیسی کے سہارے بہت کچھ مال و متاع جمع کر لیتا

ہے۔ لیکن ذات میں استحکام نہ ہونے کی وجہ سے بے باکی اور دلیری نام کو نہیں رہتی ہے۔ اس کا ایک ایک پل خوف کے سائے میں بسر ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ طبعی موت جیسی اٹل حقیقت کا سامنا نہیں کرنا چاہتا[1]۔ اس سے بچنے کے بڑے جتن کرے گا۔ معمولی سی چھینک آنے پر بھی بیسیوں حیلے اختیار کرے گا۔ اپنی حفاظت میں مال و زر کی دیواریں کھڑی کر دے گا۔ لیکن فرشتۂ اجل کو تو اپنی ڈیوٹی سرانجام دینی ہوتی ہے۔ وہ ان سب دیواروں کو پھلانگ کر ایک دن اس کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ ہر انسان کے پاس دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک اس کی جان اور دوسری اس کی ذات۔ فرشتۂ اجل کو ان دو میں سے ایک کو پھینکنا اور دوسری کو ساتھ لے کر بارگاہِ خداوندی میں پیش کرنا پڑتا ہے۔ ایسا شخص کہ جس نے ساری زندگی اپنی جان کو عزیز رکھا ہو، اور اس کی حفاظت کیلئے ہر حربہ استعمال کیا ہو، وہ اتنی آسانی سے کیسے قابو میں آسکتا ہے۔ وہ تو چاہے گا کہ فرشتۂ اجل کو بھی کچھ دے دلا کر جان کو بچا لیا جائے۔ لیکن ادھر تو سمن (SUMMON) پر لکھا ہوتا ہے کہ:

فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ (۳:۹۱)

اپنے انجامِ کار سے بچنے کی خاطر کوئی خواہ پورے کرۂ ارض کے برابر سونا بھی کیوں نہ پیش کرے، قبول نہیں کیا جائیگا۔ فرشتۂ اجل جان لے لیتا ہے! اب اس کے سامنے زندہ حالت میں اس شخص کی صرف "ذات" ہوتی ہے۔ کھوکھلی اور بوسیدہ! فرشتہ اس کی ذات کی یہ حالت دیکھ کر پوچھتا ہے۔ یہ تم نے اپنی ذات کا کیا چھیچھڑا[2] بنا لیا؟ جھوٹ بولنا تو ایسے شخص کی ذات کا شیرہ بن چکا ہوتا ہے، یہ وہاں بھی جھوٹ بولے گا اور کہے گا۔ کیا پوچھتے ہو۔ ہم زمین میں بڑے ہی کمزور تھے۔ فرشتہ کہے گا جھوٹ مت بولو۔ خدا کی زمین تو بڑی وسیع تھی لیکن وہاں تم کچھ زیادہ ہی چالاک بنتے پھرتے تھے۔ اب چلو جہنم کی طرف[3]۔ وہاں تمہارے جیسے اور بھی بہت سے سمجھ دار اکٹھے ہیں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے تھا کہ آدمؑ کو بھی اس جرم کی پاداش میں جنت سے ہاتھ دھونے پڑے تھے۔ (رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا) ۲۳:۷۔

۱: وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ (۵۰/۱۹)

۲: چھیچھڑا: گوشت کا نکما حصہ۔ نفس پر مسلسل ظلم سے جسم کے مقابلے میں ذات کی کچھ ایسی ہی حالت بن جاتی ہے۔

۳: اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ۭ
قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً
فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ۭ فَاُولٰۗىِٕكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا۔

(۴:۹۷)

قارئینِ کرام! یہ ہو سکتا ہے کہ میں انسانی ذات کی نشوونما کے اصول کو صحیح طور پر پیش نہ کر سکا ہوں۔ اسے میرے علم یا اظہارِ بیان کی کمزوری سمجھیئے، لیکن اس مغالطے میں قطعی نہ رہیئے کہ انسانی ذات کی کوئی حقیقت نہیں۔ خود قرآنِ کریم اٹھا کر پڑھیئے۔ جہاں جہاں لفظِ "نفس" ملے اس پر غور کیجیئے! اور جن آیات میں بھی اس کا اطلاق انسانی ذات پر ہوتا ہے، ان پر مزید غور کیجیئے۔ ان آیات کا سیاق و سباق دیکھئے! صرف اتنی احتیاط برتیئے کہ کسی مولوی صاحب کی فکر اثر انداز نہ ہونے پائے۔ ان حضرات کی بھی عجیب کیفیت ہے۔ انہوں نے اپنی دکان چمکانے کی خاطر تختیاں تو قرآنِ کریم کی لگا رکھی ہیں۔ جیسے، ترجمان القرآن۔ خدام القرآن۔ منہاج القرآن۔ لیکن جونہی آپ اندر داخل ہوں گے، وہاں سوائے فقہ و شریعت کے کچھ نہیں ملے گا۔ آپ لاکھ احتجاج کریں کہ صاحب آپ نے تو ہمیں قرآن کی طرف دعوت دی تھی، چاہیئے تو یہ کہ آپ اسی کے مطابق ہماری راہنمائی کریں۔ لیکن یہ صمٌ بکمٌ، اپنے مسلک سے ایک قدم اِدھر اُدھر نہیں ہٹیں گے۔ آپ ان کے فریب میں نہ آیئے! قرآنِ کریم کا آزادانہ مطالعہ کیجیئے۔ آپ پر یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی کہ انسانی زندگی کا نصب العین ــــ فقط ذات کی نشوونما ہے! انسان کو اس دنیا میں بھیجا ہی اس مقصد کیلئے تھا کہ یہ اپنی ذات کی بھرپور نشوونما کرکے لوٹے۔ اس سے کہا یہ گیا تھا کہ اللہ کی رضا اور خوشنودی اس میں ہے کہ تم اللہ کے تجویز کردہ مقصد کے حصول کے لئے بھرپور جدوجہد کرو۔ لیکن یہ حضرات بعینہ ایک نالائق اولاد کی طرح رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کسی دوسرے ہی راستے پر چل نکلے۔ مثال کے طور پر، ایک باپ اپنے بیٹے کو کسی اعلیٰ درس گاہ میں اس غرض سے بھیجے کہ وہ کچھ بن کر لوٹے، لیکن بیٹا وہاں پہنچ کر بجائے تعلیم حاصل کرنے کے باپ کی حمد و ثنا اور ذکر و تسبیح میں مشغول ہو جائے اور جب واپس لوٹے تو ویسے کا ویسا ہی کورا ہو تو کیا وہ باپ اسے چوم کر گلے سے لگائے گا؟ اور پھر کیا یہ کہے گا کہ چونکہ تم نے میری بڑی حمد و ثنا بیان کی ہے۔ لہٰذا آؤ میرے قریب بیٹھو تاکہ میں ان محلے والوں کو سینہ تان کر بتا سکوں کہ جو تم اس وقت میرے اس فیصلے پر چیں بہ جبیں ہو رہے تھے۔ بتاؤ! کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ جو کچھ میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ دیکھو ہماری ساری سٹریٹجی کیا خوبصورت تحفہ لائی ہے؟ ہمارا بیٹا کیا سے کیا بن گیا ہے ــــ یہ باپ تو ایسے بیٹے پر ہزار لعنت بھیجے گا۔ اپنے قریب تک پھٹکنے نہیں دے گا۔ بلکہ اپنے دربانوں سے کہے گا کہ اسے اٹھا کر ایسے جہنم میں پھینک دو جہاں اس کی رہی سہی صلاحیتیں بھی خاکستر ہو جائیں۔ یہ جو خدا کی خوشنودی اور پھر اس کے عوض جنت کی زندگی کو زندگی کا نصب العین قرار دیا جاتا ہے۔ اور ان کے لئے اعمالِ صالحہ، اعمالِ حسنہ، اور اعمالِ خیر وغیرہ کی تلقین کی جاتی ہے۔ تو یہ سب اسی ایک حقیقت کی مستور اصطلاحات ہیں۔ اگر ان کو کھول کر بیان کیا جائے تو ان سب کا تعلق

انسانی ذات کی نشو و نما اور اس کے نتائج کے ساتھ ملے گا۔ اللہ کے لئے اس سے بڑھ کر اور خوشی کیا ہو سکتی ہے کہ کوئی انسان اس کی ہدایات کے مطابق اپنے اندر اعلیٰ انسانی اوصاف پیدا کر لے۔ اور جسے ہم جنت کہتے ہیں۔ وہ کیا ہے؟[1]

نگاہِ بلند، سخن دل نواز، جاں پُرسوز افراد کے مجموعے کا ہی تو نام ہے!

کیا ایسے لوگوں کو جہنم میں دھکیل دیا جائے گا؟ اور پھر اسی طرح اعمالِ صالحہ کو لیجئے! اس کا تو لغوی معنیٰ ہی اس کی تشریح کیلئے کافی ہے۔ یعنی ایسے کام جو صلاحیت افزاء ہوں۔ اعمالِ حسنہ، ایسے کام جن میں حسن و توازن پایا جائے۔ اور اعمالِ خیر جنہیں عام طور پر خیرات کے کام کہا جاتا ہے۔ درحقیقت ایسے کام ہوتے ہیں جن سے انسانی ذات کے اختیارات میں وسعتیں پیدا ہوں۔ عربی لغت میں خیر اور اختیار، دونوں کا مادہ (خ۔ ی۔ ر) ہے۔

اگر ہم ذات کی نشو و نما کے بغیر جنت کے حصول کی کوشش کریں گے تو وہ کبھی بھی کامیاب نہیں ہوگی۔ ہمارا ہر عمل جو ہماری ذات کی نشو و نما کا موجب نہیں ہوگا، رائیگاں جائے گا۔ ذات کی نشو و نما تب ہوگی کہ یہ ہماری زندگی کا نصب العین بن جائے۔ ہمہ وقت نگاہوں کے سامنے! ہر کام کرنے سے پہلے سوچ لیں کہ اس کا ہماری ذات کی نشو و نما پر کیا اثر پڑے گا۔ ہمارے ہر عمل کا اثر ہماری ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ ہماری سوچیں اور ہمارے ارادے بھی ہماری ذات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۖ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (50/16)

"ہم انسان کے خالق ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اس کے دل کی گہرائیوں میں کیا کیا خیالات اور وساوس گذرتے ہیں۔ اس لئے کہ ہم انسان کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں"

"ہم جانتے ہیں" اس کی تشریح دوسرے مقام پر یوں کی:

وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ (4/111)

"جرم کا اثر ذات پر مرتب ہوتا ہے"

---

[1] قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ (۵۲:۲۶)

"اہل جنت کہیں گے۔ اس سے پہلے ہم دنیا میں ایک دوسرے کے ساتھ نہایت شفقت اور پیار و محبت سے پیش آتے تھے"

یہ خدا کی گرفت کا طریقِ کار ہے اور یہ گرفت بڑی ہی محکم ہے۔ وَ اللّٰہُ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ۔ اس کیلئے اسے نہ گواہوں کی اور نہ وکیلوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسان کے اعمال اپنے نتائج خود مرتب کرتے ہیں، سنکھیا کھایا اور موت واقع ہوگئی! اسی طرح ذات کے خلاف جرم کیا، ذات کی نشوونما رُک گئی! قیامت کے دن انسان لاکھ بہانے کرے کہ میں نے یہ جُرم نہیں کیا۔ اس کی ذات اس کے جرائم کی زندہ شہادت ہوگی۔ اس دن اس سے صرف اتنا کہا جائے گا کہ:

اِقۡرَاۡ کِتٰبَکَ ؕ کَفٰی بِنَفۡسِکَ الۡیَوۡمَ عَلَیۡکَ حَسِیۡبًا (۱۷:۱۴)

"اور انسان سے کہا جائے گا کہ لو! اپنا اعمال نامہ خود پڑھ لو۔ تمہارا حساب کرنے کے لئے باہر سے کسی محاسب کے بلانے کی ضرورت نہیں۔ خود تمہاری اپنی ذات تمہارے خلاف محاسبہ کرنے کیلئے کافی ہے۔"

اس ضمن میں ایک دوسرے مقام پر کہا:

یَعۡلَمُ خَآئِنَۃَ الۡاَعۡیُنِ وَ مَا تُخۡفِی الصُّدُوۡرُ (۴۰/۱۹)

"ظاہری اعمال تو ایک طرف، وہ تو نگاہ کی خیانتوں اور دل میں گزرنے والے خیالات تک سے واقف ہے۔"

دنیا کے قانون میں خواہ یہ قابلِ گرفت نہ ہوں لیکن قانونِ خداوندی کی رُو سے ہماری ذات پر ان کا اثر فوری ہوتا ہے

وَ اللّٰہُ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ

فلہٰذا ہمیں ذات کی نشوونما کے بارے میں انتہائی محتاط رہنا چاہیئے۔ ہماری نگہ ہر وقت اس پر مرکوز رہنی چاہیئے اور دیکھتے رہنا چاہیئے کہ یہ نشوونما پا رہی ہے یا نہیں؟ یہ جنّت اور جہنّم کے تصوّر کی طرح کوئی ایسی مبہم شئے نہیں، کہ جس کا پتہ نہ چلایا جاسکے۔ جنّت اور جہنّم کے سلسلے میں ہمیں بتایا جاتا ہے کہ یہ آخرت کے مقام ہیں۔ ان کے حصول کے لئے جو طریقِ کار بتایا جاتا ہے، اس پر عمر بھر عمل کرکے بھی شُبہ ہی رہتا ہے کہ آیا جنّت ملے گی یا جہنّم! لیکن ذات کی نشوونما کے سلسلے میں یہ مشکل نہیں پیدا ہوتی ہے۔ جس طرح ایک طالب علم کو اپنی کارکردگی کا لمحہ بہ لمحہ پتہ چلتا رہتا ہے۔ اسی طرح ایک انسان کو بھی ذات کی نشوونما پر اعمال کی اثر انگیزی کا پتہ چلتا رہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں اپنی ذات کا صحیح تصوّر پیش کرکے، انسان کی یہ مشکل آسان کردی ہے۔ اللہ نے اپنی ذات کا اظہار اپنی صفات سے کیا ہے۔ رحمٰن۔ رحیم۔ غفور۔ سمیع۔ علیم۔ عزیز۔ حکیم۔ فرق صرف اتنا ہے کہ خدا کی ذات میں یہ صفات اپنی مکمل ترین، اعلیٰ ترین، محکم ترین اور حسین ترین حالت میں پائی جاتی ہیں (الاسماء الحسنیٰ) جبکہ یہی صفات انسانی ذات میں بشری حدود کے اندر نشوونما پا سکتی ہیں۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ بعض صفات، جیسے۔ ہوالاحد، ہوالاوّل، ہوالآخر، صرف خدا کی ذات سے مختص ہیں۔ انسان کو

نہ یہ عطا ہوئی ہیں اور نہ ہی ان کی نشوونما مقصود ہے۔ ان کے علاوہ دیگر صفات خداوندی کو انسان نے علیٰ حدِّ بشریت اپنی ذات میں منعکس کرنا ہے۔ جوں جوں یہ صفات انسانی ذات میں جلوہ گر ہوتی جائیں گی، انسان کو ساتھ کے ساتھ پتا چلتا جائے گا۔ مثلاً خدا کی صفت "علیم" کو لیجئے۔ اب جو شخص علم حاصل کر رہا ہو، اسے کیسے معلوم نہیں ہوگا کہ یہ صفت اس کی ذات میں نشوونما پا رہی ہے، یا نہیں؟ وہ جوں جوں علم حاصل کرتا جائے گا۔ وہ خدا کی صفتِ 'علیم' سے قریب تر ہوتا جائیگا۔ یہی خدا کا قرب ہے اور ایسے ہی لوگوں کو خدا کے مقربین کہا جاتا ہے۔

خدا نے اپنی صفات کا متوازن تصوّر دے کر انسانوں پر بہت عظیم احسان کیا ہے۔ اگر یہ تصوّر وحی کے ذریعے نہ ملتا تو انسانی عقل کبھی بھی اس کا احاطہ نہ کر سکتی۔

ہم نے مندرجہ بالا سطور میں خدا کی صفتِ علیمی کو لبطور مثال پیش کیا ہے۔ سطحی طور پر دیکھا جائے، تو کہا جا سکتا ہے کہ اس صفت میں کونسی ایسی خوبی ہے جس کا احاطہ انسانی عقل نہیں کر سکتی۔ خدا کو نہ ماننے والے بھی تو علم حاصل کرتے ہیں۔ کیا وہ بھی مقربینِ بارگاہِ خداوندی کہلائیں گے؟ لیکن بات یوں نہیں ہے خدا کی یہ صفت دیگر صفات سے متصف ہے، وہ انسانی ذہن کے تراشیدہ تصوّرِ علم میں آج تک پیدا نہیں ہو سکیں۔ خدا صرف علیم نہیں بلکہ واسع علیم۔ سمیع علیم۔ علیم حکیم۔ علیم خبیر۔ علیم بصیر۔ علیم حلیم ہے۔ خدا کے قوانین کے تابع اور اس کے بغیر علم حاصل کرنے والوں میں یہ بنیادی فرق ہوگا۔ یعنی صفتِ علیمی میں توازن صفاتِ خداوندی کا یہ توازن جن نگاہوں سے بھی اوجھل ہے۔ ان کی حالت دیکھ لیجئے! شدید قسم کی افراط و تفریط کا شکار ہیں۔ رحم کرنے والوں کی حالت دیکھئے، ایک کیڑے تک کو مارنا پاپ سمجھیں گے، لیکن زندگی کے باقی تقاضوں سے یکسر غافل ہوں گے۔ قوت و اقتدار والوں کی سرکشی اور عدوان کو لیجئے۔ رحم و عدل جیسے لفظ ان کی لغت میں سے خارج ہوں گے۔ عالموں کو دیکھئے! بس وعظ ہی وعظ ہوگا، عمل کا شائبہ تک نہیں ملے گا۔ یہ ساری خامیاں، کمزوریاں اور نقائص اس وجہ سے پیدا ہوتے ہیں کہ انسانوں کے سامنے ذات کی نشوونما کا متوازن تصوّر نہیں ہوتا۔

خدا کے وجود کو تسلیم کرنے کا ایک حقیقی جواز یہ بھی ہے کہ اس طرح ہمیں ایک ایسی متوازن ذات کا ماڈل مل جاتا ہے جسے ہم سامنے رکھ کر اپنی ذات کی تعمیر کر سکتے ہیں۔ سورہ الحشر میں ایک بڑی اہم آیت ہے جس میں کہا گیا ہے:۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ

دیکھنا تم کہیں ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا، جنہوں نے اللہ کو فراموش کر دیا اسکا نتیجہ یہ نکلا کہ انکی اپنی ذات ہی انکی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی (۵۹/۱۹)

غالباً ایسے ہی ہیں وہ لوگ جن کے متعلق علامہ اقبالؒ نے بھی کہا ہے:

خاکِ نہالِ سدرۂ خار و خسِ چمن مشو
منکرِ او اگر شوی، منکرِ خویشتن مشو!

اس لئے کہ جو شخص اللہ (وحی اور آخرت) کا منکر ہے لیکن انسانی ذات میں عقیدہ رکھتا ہے اس سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ کسی دن ان صداقتوں کو بھی تسلیم کرلے گا، لیکن جو شخص انسانی ذات کا منکر ہے (یعنی اپنے آپ کو ایک حیوان سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتا) وہ حیوانات سے بلند و بالا کسی حقیقت کو کبھی تسلیم نہیں کرسکتا۔ اس کا ذہن اس پست سطح سے بلند ہو ہی نہیں سکتا۔ ان حقائق سے واضح ہے کہ صفاتِ خداوندی وہ معیار (STANDARD) ہے۔ جس سے یہ ماپا اور پرکھا جاسکتا ہے کہ انسانی ذات کس حد تک نشوونما پاچکی ہے یا پارہی ہے۔

نبی اکرمؐ اللہ کی ان صفات کا کامل بشری مظہر تھے۔ اسی لئے آپ کی ذاتِ اقدس کو بھی انسانوں کیلئے اسوۂ حسنہ قرار دیا۔ یعنی بہترین ماڈل۔ اسے بہترین اسوہ قرار دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کل کو کوئی انسان یہ نہ کہہ سکے کہ کسی انسان کے لئے اللہ کی صفات کو اپنی ذات میں اجاگر کرنا محال ہے۔ لہٰذا ہر انسان کو چاہیئے کہ وہ ان خدائی صفات کو اپنی ذات میں اجاگر کرے۔ یہ صفات قرآنِ کریم میں نہائت بلیغ اور واضح طور پر بیان کی گئی ہیں۔ انہیں سمجھنے میں ذرہ بھر دشواری یا الجھاؤ نہیں۔ انہیں سامنے رکھیں اور اپنی ذات کی تعمیر شروع کردیں۔ اقبالؒ کے الفاظ ہیں:

تو اپنی سرنوشت خود اپنے قلم سے لکھ!
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں!!

یوں تو ہر قانونِ خداوندی کسی نہ کسی خدائی صفت کو پیدا کرتا ہے، لیکن ان میں قانونِ انفاق ایک ایسا قانون ہے کہ جس کی اطاعت سے منجملہ صفات نشوونما پاتی ہیں۔ انفاق کا قانون یہ ہے کہ جس کے پاس جو کچھ ہو، اپنی ضروریات پوری کرلینے کے بعد دوسروں کی منفعت کیلئے کھلا رکھے۔ اس سے ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ دوسروں کی بھی اور اپنی بھی۔ اس لئے کہا:-

اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَہٗ یَتَزَکّٰی (۹۲ : ۱۸)

مَالَہٗ کا مفہوم صرف مال نہیں بلکہ یہ مَا + لَہٗ ہے۔ یعنی بقدر استطاعت جو کچھ دوسروں کی نشوونما کیلئے ہوسکے۔ اس کا صلہ اپنی ذات کی نشوونما کی شکل میں ملے گا۔ ایک دوسرے مقام پر کہا کہ انفاق سے تثبیتِ نفس ہوتی ہے۔ یعنی ذات میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔ (۲ : ۲۶۵) اس لئے میں پرزور استدعا

کروں گا کہ آپ سے جو کچھ ہو سکے، اسے اس کے مستحقین تک پہنچا دیں اور ساتھ کہیں:

لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّ لَا شُكُوْرًا ط

بھائی دیکھنا! کہیں صلے، شکریے کی بات کرکے ہمارا خسارہ نہ کر دینا۔ جو کچھ ہم نے کیا، دراصل اپنی ذات کی نشوونما کیلئے کیا ہے!

قانون کی اطاعت اگر ایک مربوط معاشرتی نظام کے تابع ہو تو یہ بھرپور طور پر نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ نبیٔ اکرمؐ نے اپنا فریضۂ رسالت (وَيُزَكِّيْكُمْ) اسی طور سرانجام دیا تھا۔ آپؐ نے کتاب و حکمت کی نہ صرف تعلیم دی (ویعلم الکتاب والحکمۃ) بلکہ اس کے مطابق ایسا نظام متشکل کیا، جس میں اقدارِ خداوندی کے اتباع سے مومنین کی ذات کی نشوونما از خود ہوتی چلی جاتی ہے۔ تحریک طلوعِ اسلام اسی عظیم مقصد کے حصول کیلئے کوشاں ہے۔ یہ لوگ، قرآنِ کریم کے خالص قوانین پر مبنی ایک ایسے معاشرے کا قیام چاہتے ہیں جس میں افرادِ معاشرہ کی ذات کی نشوونما خود بخود ہوتی چلی جائے۔ لہٰذا اس تحریک کے لئے آپ کا انفاق اس منزل کو قریب تر کرتا چلا جائے گا۔ اپنی صلاحیتوں اور مال و متاع سے اس تحریک کی آبیاری کیجئے۔ آپ کی کاوشوں کا صلہ آپ کو مل کر رہے گا۔

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ وَاَحْسِنُوْا ۛ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (۲/۱۹۵)

"حق کے نظام کے قیام کے لئے انفاق کرو۔ ایسا نہیں کرو گے تو اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو تباہی میں ڈال لو گے۔ زندگی کے ہر شعبے میں حسن کارانہ انداز سے مصروفِ جدوجہد رہو۔ یہی روش معیارِ خداوندی پر پوری اترتی ہے اور اسی سے انسانیت کا حُسن نکھرتا ہے۔"

طباعت اور پیکیجنگ کی جملہ ضروریات

کے لیئے

النور پرنٹرز و پبلشرز ۲/۳ فیصل نگر ملتان روڈ لاہور ۲۵

ٹیلی فون ۲۷۵۸۲۶

روئداد

تقریب "قرار دادِ پاکستان گولڈن جوبلی" لندن

بزمِ طلوعِ اسلام لندن نومبر ۱۹۶۱ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس کا دوبارہ احیاء ۱۹۷۵ء میں ہوا۔ پرویز صاحب کے قرآنی درسوں، رفقائے محفل کا تبادلۂ افکار و خیالات کا سلسلہ ماہانہ اجتماع کی صورت میں باقاعدگی سے جاری ہے۔ ان ۲۸ سالوں پر محیط عرصہ میں چند بے لوث احباب کی مساعیٔ جمیلہ سے پیغامِ قرآنی انگلستان کے ہر علاقہ میں پہنچ رہا ہے۔ تاہم چند سالوں سے بزم محسوس کر رہی تھی کہ ماہانہ اجلاس میں بیشتر پرانے چہرے ہی ہوتے ہیں لہٰذا اسے ڈرائنگ روم کی چار دیواری سے نکال کر صلائے عام کرنے کا فیصلہ کیا اور اس سمت میں عملی قدم پہلی یورپی کنونشن منعقدہ اگست ۱۹۸۷ء کی شکل میں اٹھایا گیا، اس کے خوش کن نتائج دیکھتے ہوئے حوصلے و عزائم اور بلند ہوئے۔ اگلے سال ۱۹۸۸ء میں یومِ جشنِ آزادی کی تقریب کھلے عام لندن کے ایک مرکزی پبلک ہال میں منائی گئی۔ علامہ پرویز صاحب مرحوم کا خصوصی خطاب "یہ وہ سحر تو نہیں"..... وجہِ شادابی و طمانیتِ قلب ثابت ہوا۔ اسی سلسلہ و طریقۂ نشر و اشاعت کو مزید وسعت دیتے ہوئے قرآنی پیغام کو عامتہ النّاس تک پہنچانے، نظریۂ پاکستان کو اجاگر کرنے اور تحریکِ طلوعِ اسلام کے مقصد و مسلک سے متعارف کرانے کے لئے۔ بروز اتوار یکم اپریل ۱۹۹۰ء بہ تعاون ایشین سنٹر والتھم سٹو لندن ای ۱۷، قرار دادِ پاکستان کی گولڈن جوبلی تقریب منائی گئی۔

ایشین سنٹر کے خوبصورت وسیع و عریض ہال کو بینرز، پوسٹرز، پاکستان کے تاریخی و قدرتی مناظر، مشاہیرِ پاکستان کی تصاویر سے آراستہ و پیراستہ کرنے میں جناب شہباز خاں صاحب اور ان کے معاونین نے جس جوش و خروش سے کام کیا وہ قابلِ ستائش ہے۔

ٹھیک وقتِ مقررہ پر مہمانِ خصوصی سفارت خانہ پاکستان کے کرنل عبدالرحیم کی صدارت میں جلسہ کا آغاز تلاوتِ قرآنِ کریم سے ہوا۔

سٹیج سیکرٹری کے فرائض محترم شہباز خاں کے سپرد تھے۔ نمائندہ بزم لندن اور نمائندہ رابطہ باہمی بزمہائے طلوعِ اسلام یو کے مقبول محمود فرحت نے تحریکِ پاکستان کے محرکات پر مختصر روشنی ڈالی اور کہا کہ مطالبہ پاکستان اور نظریۂ پاکستان ابھی تشنۂ تکمیل ہے۔ اس کی تکمیل اس وقت ہوگی جب خطۂ کشمیر کے مسلمان بھی اپنا

حقِ خود ارادیت حاصل کر کے پاکستان میں شمولیت کا فیصلہ صادر کر دیں گے۔ اب ان نہتے بے بس مظلوم کشمیری مسلمانوں کے جذبۂ حریت کو دنیا کی کوئی طاقت کچل نہیں سکتی۔

علامہ پرویزؒ صاحب اور تحریکِ طلوعِ اسلام کے تعارف کو وقت کی کمی کے پیشِ نظر مختصر رکھتے ہوئے کہا کہ جلسہ کے اختتام پر چند پمفلٹس مفت تقسیم کر دیئے جائیں گے۔ ان کے مطالعہ سے پرویزؒ صاحب کی شخصیت تحریکِ طلوعِ اسلام کے اغراض و مقاصد کے بارے میں بھرپور تفصیل ملے گی۔

اس کے بعد محترم محمد بشیر سیکرٹری بزم نے ظہیر نیاز بیگی کی نظم "پیغام بہ ملتِ پاکستانیہ" سنائی اور سامعین نے نظم کے اس پُر مغز اور سبق آموز مصرعہ پر:

ڈرو خدا سے فکر کرو کچھ　　مکر و ریا سے کام نہ لو
یا اسلام پہ چلنا سیکھو　　یا اسلام کا نام نہ لو

خوب داد دی۔

ماہِ رمضان کی وجہ سے کچھ خدشہ تھا کہ حاضرین کی تعداد شاید توقعات سے کچھ کم رہے مگر جہاں قرآنی پیغام کی صدا بلند ہو رہی ہو وہاں قلبِ سلیم رکھنے والوں اور شمعِ قرآنی کے پروانوں کی کمی نہیں ہو سکتی، ہال پُر ہو چکا تھا۔ مزید نشستیں لگانی پڑیں۔ اب مفکرِ قرآن کا نشید اور خصوصی خطاب "پاکستان کس نے مانگا، کیوں مانگا" بذریعہ وڈیو دکھایا گیا۔ پونے دو گھنٹہ کے خطاب میں پرویزؒ صاحب نے تحریکِ پاکستان، مطالبۂ پاکستان کے سیاسی اور ایک آزاد اسلامی مملکت کے حصول کے دینی تقاضا کو جس حسن و خوبی سے اجاگر کیا اسے ضبطِ تحریر میں لانا مشکل ہے۔

انہوں نے بصراحت بتایا کہ مطالبۂ پاکستان نہ تو کسی قادیانی کی اختراع تھی نہ انگریز کی سکیم تھی۔ نہ یہ کوئی وکیلانہ حربہ تھا اور نہ ہی یہ ہندو کی تنگ نظری کا ردِ عمل تھا۔ ہال میں ایک وجد آور سکوت اور مفکرِ قرآن کا حسنِ بیاں۔ ایک عجیب سماں تھا۔ ایک ایک جملہ اور ہر جملہ کا ایک ایک لفظ اپنے اندر ایک تاریخی حقیقت اور علمی دلائل کی ایک دنیا سموئے ہوئے تھا۔

اس حقیقت کشا خطاب کے بعد والتھم فارسٹ بارو کونسل کے ریس ریلیشنز محکمہ کے سربراہ جناب قادر بخش نے کہا کہ مقامی مسلمان۔ تعلیمی سماجی ثقافتی ضروریات کا ایک متفقہ علیہ پروگرام پیش کریں تو بارو کونسل ہمدردانہ غور کرے گی۔

مقامی کونسلر فضل الرحمٰن جو بنگالی نژاد ہیں، مگر خود کو مسلم لیگی اور پاکستانی تصور کرتے ہیں، انہوں نے لارڈ کرزن کے عہد ۱۹۰۶ء میں بنگالی مسلمانوں کی معاشی و سیاسی پست حالی کے مدِ نظر اسوقت تقسیم بنگال اور

سنہ ۱۹۴۷ء میں دوبارہ بنگال کی تقسیم کا موازنہ کرتے ہوئے ہندو کی میکیاولی ذہنیت سے پردہ اٹھایا۔ انہوں نے کہا کہ سات سال کی مختصر مدت میں پاکستان کا حصول علامہ اقبالؒ کی مومنانہ فراست اور قائدِ اعظمؒ کی دیانتدارانہ سیاسی بصیرت کا نتیجہ تھا۔

آخر میں مہمانِ خصوصی کرنل عبدالرحیم نے فرمایا کہ علامہ پرویزؒ صاحب مرحوم کے بصیرت آموز خطاب کے بعد تحریک و نظریۂ پاکستان کے متعلق کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہی۔ اس سے قبل انہوں نے پرویزؒ صاحب کی نہ کوئی تصنیف پڑھی تھی، نہ کوئی درس سنا تھا۔ انہوں نے پاکستانیوں کو قائدِ اعظم کے تین سنہری اصولوں اتحاد، تنظیم، یقین محکم پر عمل کرنے کی تلقین کی اور کہا کہ یہی ایک راہِ عمل ہے جس پر گامزن ہو کر مملکتِ پاکستان مستحکم بن سکتی ہے۔

بکسٹال کا انتظام حسبِ سابق رفقائے سفر، ریاض احمد اور عبدالرزاق کے سپرد تھا۔ ان کے حسنِ اخلاق اور کتب کی ترتیب و آرائش کی وجہ سے سٹال پر بہت ہجوم رہا اور کثیر تعداد میں کتب فروخت ہوئیں۔ ساڑھے پانچ بجے یہ پُروقار سنجیدہ تقریب اختتام پذیر ہوئی۔

اسی شام کئی ایک احباب نے فون پر اپنے تاثرات سے مطلع کیا اور کہا کہ ایسا سنجیدہ جلسہ شاذ ہی دیکھنے میں آیا ہو۔

اگلے ہفتہ لندن کے کثیر التعداد اشاعت ویکلی اخبارِ وطن نے اس جلسہ کی کاروائی کی خبر شائع کی۔

مقبول محمود فرحت نمائندہ بزمِ لندن

R E M E M B E R

Belief in Islam does not mean mere confession of the existence of something. It really means the translation of the faith into action. Words without deeds carry no meaning in Islam. Therefore the term ***"believe and do good"*** has been used like a phrase all over the Quran. Belief in something means that man should inculcate the qualities or carry out the prompting of guidance of that thing in his action. Belief in Allah means that besides acknowledging the existence of the Author of the Universe. We are to show obedience to His commandments.

The Running commentary of the Holy Quran
by Dr. K.R.Noori

حقائق وعبر

سیّد مودودی کی ہندو نوازی

سید ابوالاعلیٰ مودودی بزعمِ خود اسلامی نظام کے علمبردار تھے لیکن ہندوؤں سے ان کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ ان کی پہلی باضابطہ تصنیف پنڈت مدن موہن مالویہ کی سوانح حیات پر مبنی ہے۔ جس میں سید مودودی نے پنڈت مالویہ سے اپنی محبت کو راز نہیں رکھا اور کھل کر انہیں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ یہ پنڈت مدن موہن مالویہ وہی تھے جن کی شہرت ہندومت کے ساتھ ان کی زبردست وابستگی میں پوشیدہ تھی۔ سیاست میں کانگریس اور ہندو مہاسبھا کے ساتھ ان کا نام ہندوستان کی تاریخ کا جزو بن چکا ہے، وہ کٹر ہندو فرقہ پرست جماعت "ہندو مہاسبھا" کے بانی تھے۔ ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے جواب میں پنڈت مالویہ نے "ہندو مہاسبھا" کی بنیاد رکھی۔ اس جماعت کے مسلح رضا کاروں نے تقسیم ہند کے وقت بے گناہ ہندی مسلمانوں کا بے دریغ قتلِ عام کیا تھا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو ترقی کرتا دیکھ کر پنڈت مالویہ سے رہا نہ گیا اور انہوں نے اسی نہج پر ہندو بنارس یونیورسٹی قائم کی۔ اس یونیورسٹی کے لیے انہوں نے ۱۹۱۱ء سے کوششیں شروع کیں اور پانچ سال کی سخت جدوجہد کے بعد ۱۹۱۶ء میں ہندو بنارس یونیورسٹی بنوا کر دم لیا۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۱ء تک پنڈت مالویہ اس یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔

مشہور انگریز مصنف سی۔ ایف اینڈریوز اپنی کتاب "گریٹ مین آف انڈیا" کے صفحہ ۲۴۷ پر لکھتا ہے کہ "پنڈت مدن موہن مالویہ موجودہ نسل کے سب سے زیادہ قدامت پسند ہندو تھے جس کے سبب انہیں مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ ہندو انتہاپسندی کے باعث ہندوستانی سیاست کے ہر بڑے لیڈر سے ان کے اختلافات رہے۔ میں نے ان سے زیادہ کسی کو اتنا قدامت پسند ہندو نہیں پایا اور جیسے جیسے وہ بوڑھے ہوتے گئے ان کے اندر ہندو انتہاپسندی اور ہندو ازم مضبوط ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ انکا بھارتی نیشنلزم پس منظر میں چلا گیا اور ہندو ازم ان پر چھا گیا۔"

ایسے کٹر ہندو فرقہ پرست لیڈر کے حالاتِ زندگی پر سید مودودی نے اپنی پہلی باضابطہ کتاب لکھی، جس کا عنوان ہے "حالاتِ زندگی آنریبل پنڈت مدن موہن مالویہ آف الہ آباد" جسے دفتر تاج جبلپور نے

شائع کیا اور مطبوعہ اشتراکی پریس دہلی سے ۱۹۱۹ء میں چھپوایا گیا۔

سید مودودی کی اس تصنیف کا ایک اچھا اور مکمل نسخہ خدا بخش لائبریری (پٹنہ) میں محفوظ ہے۔ اس نسخہ کا عکس ادارہ "ہفت روزہ احوال" نے حاصل کیا ہے جو قارئین کی معلومات کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔

اس کتاب کے پیش گفتار میں لکھا گیا ہے کہ "یہ مولانا مودودی کی پہلی باضابطہ تصنیف ہے۔ اس کتاب کا ذکر نہ تو مولانا نے خود اپنی کسی تحریر یا تقریر میں کیا ہے اور نہ مولانا پر لکھنے والوں میں سے کسی نے اس کا حوالہ دیا ہے۔ دراصل مولانا نے دو کتابیں گاندھی جی اور مالویہ جی پر ایک ساتھ لکھی تھیں۔ گاندھی جی سے متعلق کتاب کے بارے میں اس وقت کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا کیا حشر ہوا یا اب کہاں ہے؟ البتہ حالاتِ زندگی پنڈت مدن موہن مالویہ ۱۹۹۰ء میں دفتر تاج جبلپور سے شائع ہوئی تھی اب دستیاب ہے۔

اسی "پیش گفتار" میں مولانا مودودی کی اپنی تحریر کے حوالہ سے "ان کی اپنی زندگی کی کہانی ان کی اپنی زبانی" میں لکھا گیا ہے کہ "جب میں کالج کی تعلیم سے فارغ ہوا تو اس وقت میری عمر سولہ سترہ برس کی تھی۔ اس کے بعد میں نے آوارہ خوانی کی جو کچھ ملا پڑھ ڈالا۔ اس آوارہ خوانی کا نہائت خطرناک نتیجہ برآمد ہوا۔ خدا اور آخرت پر سے یقین اُٹھ گیا۔ تشکیک وارتیاب سے ایمان ویقین کی بنیادیں منہدم ہوگئیں خدا کا وجود سمجھ میں نہ آتا تھا۔ تمام دینی عقائد لغو اور غیر منطقی نظر آتے تھے۔ ایک ڈیڑھ سال یہی کیفیت رہی۔"

یہاں اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ خود ان کے بیان کے مطابق سید مودودی نے کالج تک تعلیم حاصل کی تھی مگر وہ ہمیشہ اپنے پیروکاروں سے اس بات کو چھپاتے رہے، اس میں کیا راز تھا یہ وہی بہتر جانتے ہونگے۔ شاید وہ خود کو کم پڑھا لکھا ظاہر کر کے اپنی تحریروں کو کشف و الہام کا درجہ دینا چاہتے ہوں۔ تاہم زیرِ بحث کتاب کے منظرِ عام پر آنے کے بعد ان کا ڈبل اسٹینڈرڈ اور دوغلا پن کھُل کر سامنے آگیا ہے۔ (ادارہ)

(بحوالہ ہفت روزہ "احوال" کراچی ۲۸ ستمبر تا ۴ اکتوبر ۱۹۸۹ء)

پی۔ اے۔ ٹی کے قائد، پھر بارگاہِ رسالتؐ میں

ادارہ منہاج القرآن، بقول وابستگانِ ادارہ اللہ ربّ العزت کی خصوصی رحمت، جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے بے پایاں لطف وکرم اور جناب غوثیت مآب حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ اور دیگر اولیاء کے فیضان کا مظہر ہے۔

اس کے بانی اور قائد کی ولادت بھی صحابہ اہلِ بیت حضور علیہ السلام کی بشارت پر ہوئی اور نام بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی رکھا۔ (منہاج القرآن، مئی ۱۹۸۹ء صـ ۳۳)

ملک میں اسلامی ذہن رکھنے والی بے شمار سیاسی پارٹیوں کی موجودگی میں اس ادارہ نے اپنی الگ سیاسی جماعت بنانے کا فیصلہ کیا تو بانئ تحریک نے ضروری سمجھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ اقدس میں حاضر ہو کر آپ سے نظرِ کرم کی بھیک مانگی جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے قائدِ تحریک کی سربراہی میں ادارے کی نمایاں شخصیات پر مشتمل خاصا بڑا وفد بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا اور قائدِ تحریک نے اپنی سیاسی پارٹی کا نام حضور علیہ السلام کی بارگاہِ اقدس میں اس دعا کیساتھ پیش کیا کہ حضورؐ ان کے قیامِ مدینہ ہی میں کسی ایسی علامت کا اظہار فرما دیں جس سے انہیں (قادری صاحب کو) اطمینانِ قلب نصیب ہو کہ آپ نے اسے اپنی بارگاہ میں قبول فرما لیا ہے۔

بقول قادری صاحب "اسی روز آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے غلام کی آرزو کی تکمیل بھی فرما دی جو بعد میں آپ نے مسجدِ نبوی میں تمام اہلِ قافلہ کو خوشخبری کی صورت میں سنائی۔" (منہاج القرآن بابت جون، جولائی ۱۹۸۹ء)

مزید برآں:-

"اسی روز منہاج القرآن ویمن لیگ کی بعض سرکردہ بہنیں پروفیسر صاحب سے ملاقات کیلئے تشریف لائیں جن میں مسز مہاجر بھی شامل تھیں، انہوں نے ایک نہائت روح پرور اور ایمان افروز خواب سنایا۔ انہوں نے بتایا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ہم ایک قافلے کی صورت سرکارؐ دو عالم کے درِ اقدس پر حاضر ہیں اور اصحابِ صفہ کے چبوترے پر بیٹھے ہیں۔ مسجدِ نبوی کو سجایا جا رہا ہے۔ مسجدِ نبویؐ کے خدام سیڑھیاں لئے چلے آ رہے تھے۔ بعد ازاں ایک خادم سیڑھی پر چڑھ کر ایک جلتا ہوا بلب اتارتا ہے اور اس کی جگہ نیا بلب لگا دیتا ہے۔ ہمارے پوچھنے پر وہ بتاتا ہے کہ پروفیسر صاحب آئے ہیں، اس لئے مسجد کو سجایا جا رہا ہے۔ میں دل ہی دل میں خوش ہو رہی ہوں اور اللہ کا شکر ادا کر رہی ہوں اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ معمر خاتون مسز مہاجر نے جب یہ خواب اپنے بہن بھائیوں کی موجودگی میں قائدِ تحریک کو سنایا تو فرطِ مسرت سے ہر ایک کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ بعد ازاں حاضرین میں مٹھائی تقسیم کی گئی جو خواب کی خوشی میں وہ اپنے ہمراہ لائی تھیں۔"

(منہاج القرآن بابت جون، جولائی ۱۹۸۹ء صـ ۷٦)

اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرمؐ سے فرمایا تھا:

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ (۶/۱۵۹)

جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر لیا اور پارٹیوں میں بٹ گئے۔ اے رسولؐ تیرا اُن سے کوئی سروکار نہیں!

جبکہ طاہر القادری صاحب کا دعوےٰ ہے کہ پارٹی سازی کے لئے انہیں آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی آشیرباد حاصل ہے اور ایک معمر خاتون بربنائے خواب اس کی گواہ بھی ہیں۔

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے!

اعتکاف اور صحابہ کرامؓ

ہمارے علماء حضرات اعتکاف کو ایک سو شہیدوں کے ثواب کے برابر قرار دیتے ہیں۔ اس بارے میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے خاندان کے ہفت روزہ ندا میں یہ شرعی حکم بیان کیا گیا ہے۔

"ہمارے دین میں رمضان کے آخری عشرے کی اہمیت، اس عشرے میں اعتکاف، اس کی راتوں میں طویل قیام اور شب قدر کی تلاش وہ حقیقتیں ہیں جن سے کسی کو اختلاف نہیں اس سب کے باوجود ہم اس عشرے میں اپنی انفرادی کیفیات اور معاشرے کے اجتماعی معمولات کا جائزہ لیں تو بالعموم وہ کیفیت نظر نہیں آتی جس کا تقاضا ہمارا دین ہم سے کرتا ہے۔" (ہفت روزہ ندا لاہور بابت ۲۴ اپریل ۱۹۹۰ء صـ ۲۰)

حالانکہ مالکی فقہ کے بانی حضرت امام مالک فرماتے ہیں کہ شریعت اسلامی میں اعتکاف کی کوئی حیثیت نہیں۔ کوئی صحابی کبھی بھی اعتکاف نہیں بیٹھا۔ اگر اعتکاف کی کوئی شرعی حیثیت ہوتی تو صحابہ کرامؓ اس پر ضرور عمل کرتے۔ (نیل الاوطار۔ شرح منتقی الاخبار صـ ۲۷۹)

ساری عمر نماز پڑھنے کی ضرورت نہیں

ہمارے مذہبی پیشوا بعض اوقات ایسی لایعنی باتوں کی تشہیر کرتے ہیں کہ اسلام کے متعلق تعلیم یافتہ طبقے پر خوشگوار اثرات مرتب ہونے کی بجائے اُلٹا اثر ہوتا ہے۔ رمضان المبارک کے درمیان فرقہ اہل حدیث

کے تمام اخبارات میں لیلۃ القدر کے بارے میں ایک مضمون شائع ہوا، جس میں اس رات کی فضیلت کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے۔

"اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ۔ ہم نے اس قرآن کو شبِ قدر میں نازل کیا جوکہ احادیث کی روشنی میں ۲۱، ۲۳، ۲۵، ۲۷ یا ۲۹ ہوسکتی ہے۔

اور جس کی عبادت ۸۳ سال ۴ مہینے کی عبادت سے افضل ہے۔

ایک رات کو ہی کسی کو ۸۳ سال سے زیادہ کی عبادت کا ثواب مل جائے تو، پھر اسے ہر روز اس مشق کو دہرانے کی کیا ضرورت ہے؟

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے نزدیک قومی مسائل کا حل

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے خاندان کی جانب سے ایک رسالہ ہفت روزہ ندا شائع ہوتا ہے اس کے کرتا دھرتا ان کے بیٹے عاکف سعید صاحب ہیں، اس رسالے میں قومی مسائل پر بحث ہوتی ہے اور پھر ان کا حل پیش کیا جاتا ہے۔ جمہوریت کی بحالی کے بعد اظہارِ رائے کی جو آزادی ملی ہے اور جس کے نتیجے میں حکمران طبقے پر تنقید ہو رہی ہے تو اس سے یہ حضرات گھبرا گئے ہیں۔ اور اس گھبراہٹ کے نتیجے میں قومی مسائل کا حل یہ پیش کیا ہے۔

"ہمیں پیپلز پارٹی اور آئی جے آئی میں سے کسی سے بھی کچھ لینا ہے نہ دینا۔ ان میں سے کوئی ایک یا دونوں لڑ بھڑ کر ختم ہو جائیں تو قیامت نہیں آجائے گی۔ قوم نے حرام خوری سے اپنے بدن میں فالتو خون کا ذخیرہ کر لیا ہے تو فوج سے مڈ بھیڑ میں اس کی زکات نکل جانے میں بھی حرج نہیں، انت بھلا سو بھلا لیکن کیا اس کا انجام بخیر ہوگا؟"

(ہفت روزہ ندا بابت ۱۷ اپریل ۱۹۹۰ء ص ۴)

دیکھئے اسلامی انقلاب کے علمبرداروں نے قومی مسائل کا کیسا شاندار حل پیش کیا ہے۔

طلوعِ اسلام خود پڑھئے اور دوسروں کو پیش کیجئے

قرآنی تعلیم بچوں کیلئے
قاسم نوری

اسلام (۲)

(گزشتہ سے پیوستہ)

عزیز بچو! تم نے وہ سپاہی تو دیکھا ہوگا جو کسی چوک یا چوراہے پر کھڑا ٹریفک کو کنٹرول کر رہا ہوتا ہے۔ کیسا اچھا لگ رہا ہوتا ہے۔ کوئی بدانتظامی نہیں ہوتی۔ کوئی گڑبڑ اور حادثہ نہیں ہوتا۔ سب گاڑیاں اور لوگ سکون سے آجا رہے ہوتے ہیں۔ یہ سب کس طرح ہوتا ہے؟ بھئی یہ ایسے ہوتا ہے کہ حکومت نے چلنے پھرنے کے لئے ایک قانون بنایا ہُوا ہوتا ہے اور لوگ اس قانون کی پابندی کر رہے ہوتے ہیں اور اس پابندی کی وجہ سے سب کی زندگیاں بھی محفوظ ہوتی ہیں۔ اور امن و امان اور سکون بھی قائم رہتا ہے۔

اچھا اب سوچو کہ اگر یہ قانون نہ ہو اور سپاہی ٹریفک کو کنٹرول نہ کر رہا ہو تو پھر کیا ہو؟ ...... توبہ توبہ سوچنے سے ہی ڈر لگتا ہے ـــ کوئی دائیں طرف مڑ رہا ہے کوئی بائیں طرف جا رہا ہے ـ کسی نے بیچ چوراہے میں گاڑی کھڑی کر دی ہے۔ کسی نے راستہ ہی روک دیا ہے ـــ ایک دوسرے کو دھکیل رہے ہیں ـــ ٹکرا رہے ہیں ـــ جھگڑ رہے ہیں چیخ رہے ہیں ـــ شور، افراتفری، ہنگامہ، حادثہ ـــ سارا ماحول بگڑ کر رہ جائے اور سارا سکون برباد ہو کر رہ جائے۔

تو بھئی معلوم یہ ہُوا کہ زندگی گزارنے کے لئے بھی انسانوں کو کسی نہ کسی ایسے ہی قانون کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر یہ قانون نہ

نہ ہو تو ساری دنیا کا وہی حشر ہو جائے جو قانون اور سپاہی کے نہ ہونے سے چورا ہے پر نظر آتا ہے۔

بچّو! جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو پھر یہ سوچنا پڑے گا کہ کروڑوں، اربوں انسانوں کی زندگی کے لئے ایک جیسا قانون کون بنائے؟ ___ کوئی انسان تو ایسا کر نہیں سکتا۔ اس لئے کہ ہر انسان زیادہ سے زیادہ اپنے مُلک اور اپنی قوم کے لئے ہی کچھ کر سکتا ہے تو معلوم ہُوا کہ یہ کام ایسی ہستی کر سکتی ہے جس کا قانون بنانے میں اپنا کوئی فائدہ نہ ہو اور وہ سب انسانوں کے فائدے کو سامنے رکھ کر قانون بنائے۔ ظاہر ہے ایسی ہستی صرف اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ وہی انسانوں کو پیدا کرنے والا ہے اور وہی ہر انسان کے مزاج، ضرورت اور کیفیت سے واقف ہے۔

چنانچہ بچّو! اللہ تعالےٰ نے انسان کو بنایا تو اس کو زندگی گزارنے کے طریقے بھی بتائے۔ یہ طریقے اور قانون اللہ نے اپنے رسولوںؑ کے ذریعے سے انسانوں تک پہنچائے۔ پھر جس جس نے ان قوانین کی پابندی کی اس نے زندگی بھی عزّت، سکون اور آرام کی گزاری اور مرنے کے بعد کی زندگی (جسے آخرت بھی کہتے ہیں) بھی شاندار بنالی ___

یہ دو بنیادی باتیں جاننے کے بعد اب تیسری اور سب سے اہم بات بھی سمجھ لو کہ یہ دنیا میں جتنے بھی مذہب ہیں نا ___ یہ سب کسی نہ کسی انسان یا انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں اور اسی لئے الگ الگ ہیں ___ بھئی یہ بات تو ابھی پڑھ چکے ہو نا کہ کوئی بھی اور کسی بھی علاقہ کا رہنے والا انسان ساری دنیا کے انسانوں کے لئے مشترکہ قانون نہیں بنا سکتا ___ ویسے بھی کسی بھی مذہب کا کوئی

ماننے والا کیوں نہ ہو وہ تو صرف اپنے لئے عبادت کرتا ہے۔ اپنی یا زیادہ سے زیادہ اپنے رشتہ داروں اور عزیزوں کی خیر مانگتا ہے۔ دوسرے انسانوں سے تو اسے غرض ہی نہیں ہوتی۔ لہٰذا مذہب پر چلنے والے لوگ زندگی کی ٹریفک کو "جام" کر کے رکھ دیتے ہیں۔ نہ خود کوئی ترقی کر سکتے ہیں نہ کسی دوسرے کو آگے نکلنے دیتے ہیں۔ ساری زندگی جامد اور مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے ____

اور جب جب ایسا ہوتا تھا۔ اللہ تبارک و تعالےٰ کی طرف سے ہدائت اور راہنمائی کے اصول اور قانون لے کر کوئی نہ کوئی رسولؐ آجاتا تھا ____ حتیٰ کہ انسانیت باشعور اور بالغ ہوگئی۔

اور پھر اللہ نے اپنا آخری نبی، آخری ہدایت اور قانون / قرآن کی شکل میں بھیجا جس نے بتایا کہ یہ ہدایت یا یہ قانون کوئی مذہب نہیں ہے بلکہ یہ 'دین' ہے یعنی ایک طریقہ اور نظام ہے جو زندگی گزارنے کا انداز سکھاتا اور بتاتا ہے اور اس کا نام "اسلام" ہے۔

انشاء اللہ تعالےٰ آئندہ سبق میں ہم آپ کو اسلام کے متعلق مزید معلومات دیں گے۔

نوجوانوں کے لئے فکر و نظر کی نئی راہیں

سلیم کے نام

از پرویزؒ

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کی

مطبوعات کی قیمتیں جنوری ۱۹۹۰ء

نوٹ: اِن قیمتوں میں ڈاک اور پیکنگ کا خرچ شامل نہیں

نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ۔ کھلے پارے)	۱۵۰/۰۰ روپے	برقِ طور (تازہ ایڈیشن)	۶۰/۰۰ روپے
پارہ نمبر ۱، ۳۰ (فی پارہ)	۶/۰۰ "	شعلۂ مستور (تازہ ایڈیشن)	۶۰/۰۰ "
پارہ نمبر ۲ تا ۲۹ (فی پارہ)	۵/۰۰ "	معراجِ انسانیت (تازہ ایڈیشن)	۶۰/۰۰ "
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ۔ مجلّد)	۱۷۰/۰۰ "	مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں (اعلیٰ ایڈیشن)	۵۰/۰۰ "
(تین جلدوں میں۔ فی جلد)	۶۰/۰۰ "	(سٹوڈنٹ ایڈیشن)	۲۰/۰۰ "
لغات القرآن۔ (مکمل سیٹ۔ مجلد۔ ایک جلد میں)	۲۸۵/۰۰ "	اِنسان نے کیا سوچا؟ (تازہ ایڈیشن)	۷۵/۰۰ "
چار جلدوں میں (فی جلد -/۷۵)	۳۰۰/۰۰ "	اِسلام کیا ہے؟ (تازہ ایڈیشن)	۵۰/۰۰ "
تبویب القرآن۔ تازہ ایڈیشن (تین جلدوں میں)	۲۵۰/۰۰ "	کتاب التقدیر (تازہ ایڈیشن)	۵۰/۰۰ "
ایک جلد میں	۲۴۰/۰۰ "	جہانِ فردا	۴۵/۰۰ "
مطالب الفرقان - چھ جلدیں	۴۶۵/۰۰ "	شاہکار رسالتؐ (تازہ ایڈیشن)	۷۵/۰۰ "
(جلد اوّل، دوم۔ تازہ ایڈیشن۔ جلد سوم) ہر جلد	۷۵/۰۰ "	نظامِ ربوبیت (تازہ ایڈیشن)	۵۰/۰۰ "
مطالب الفرقان - جلد چہارم	۹۰/۰۰ "	تصوف کی حقیقت	۶۰/۰۰ "
مطالب الفرقان۔ جلد پنجم و ششم (ہر جلد)	۷۵/۰۰ "	قرآنی قوانین (ڈیلکس ایڈیشن)	۵۰/۰۰ "
من و یزداں (تازہ ایڈیشن)	۷۵/۰۰ "	(سٹوڈنٹ ایڈیشن)	۱۰/۰۰ "
ابلیس و آدم (تازہ ایڈیشن)	۷۵/۰۰ "	سلیم کے نام خطوط (مکمل سیٹ)	۸۵/۰۰ "
جوئے نور (تازہ ایڈیشن)	۶۰/۰۰ "	(جلد اوّل ۴۰ روپے، دوم -/۲۰ روپے جلد سوم ۲۵/۰۰ ")	

نام کتاب	قیمت
طاہرہ کے نام خطوط (ڈیلکس ایڈیشن)	۶۰/۰۰ روپے
(سٹوڈنٹ ایڈیشن)	〃 ۱۲/۰۰
اسلامی معاشرت	〃 ۶/۰۰
مقامِ حدیث (تازہ ایڈیشن)	〃 ۱۰/۰۰
قرآنی فیصلے جلد اول (سابقہ اول، دوم، سوم)	〃 ۶۰/۰۰
جلد چہارم، پنجم (فی جلد)	〃 ۱۳/۰۰
ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت	〃 ۴۵/۰۰
حسنِ کردار کا نقش تابندہ (تازہ ایڈیشن)	〃 ۱۲/۰۰
تحریکِ پاکستان اور پرویزؒ (ڈیلکس ایڈیشن)	〃 ۲۵۰/۰۰
(سٹوڈنٹ ایڈیشن)	〃 ۷۰/۰۰
نوادرات۔ مجلد	〃 ۷۵/۰۰
پیپر بیک	〃 ۶۰/۰۰
اسبابِ زوالِ اُمت	〃 ۳/۰۰
قتلِ مرتد اور غلام اور لونڈیاں اور یتیم پوتے کی وراثت	〃 ۸/۰۰
اقبالؒ اور قرآن۔ جلد اول (ڈیلکس ایڈیشن)	〃 ۴۵/۰۰
جلد دوم (ڈیلکس ایڈیشن)	〃 ۷۰/۰۰
پرنسپلز آف لاء میکنگ اِن اسلام (انگریزی)	〃 ۶/۰۰
ISLAM A CHALLENGE TO RELIGION DELUXE	〃 100/-
STUDENT	〃 35/-
ISLAMIC WAY OF LIVING	〃 25/-

نام کتاب	قیمت
حسبِ ذیل کُتب کے سابقہ ایڈیشن ختم ہو چکے ہیں۔ طبعِ نو پر اطلاع دی جائے گی۔ جہاد، سلسبیل، بہارِ نو، الفتنۃ الکبریٰ، منزل بہ منزل، فردوسِ گم گشتہ، پاکستان کا معمارِ اول، تاریخ الامت، فجر الاسلام۔	
مطبوعات النور پرنٹرز	
قبلۂ اول (حسن عباس رضوی مرحوم)	۳۵/۰۰ روپے
میجر عزیز بھٹی شہیدؒ (نشانِ حیدر)۔ سوانح حیات (از: اصغر علی گھرال ایڈووکیٹ)	〃 ۱۰۰/۰۰
SIR SYED AHMED KHAN AS AN EDUCATIONIST (SHAMIM ANWAR)	〃 40/-
لسان القرآن (از: پروفیسر رفیع اللہ شہاب)	〃 ۳۰/۰۰
تحریکِ پاکستان گولڈ میڈل 1989 (مرتبہ: شعبہ تحریکِ پاکستان محکمہ اطلاعات و ثقافت پنجاب)	〃 ۷۵/۰۰
تصنیفات ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب	
PHENOMENA OF NATURE & QURAN	〃 84/-
THE HEAVENS, THE EARTH & THE QURAN	〃 84/-
FOOD AND HYGIENE IN ISLAM	〃 9/-
GATEWAY TO THE QURAN	〃 54/-
CONSPIRACIES AGAINST THE QURAN	———
مظاہرِ فطرت اور قرآن	〃 ۱۳۲/۰۰

کتابیں ملنے کے پتے: طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور، پاکستان۔ فون ۸۷۹۲۴۶ ✲ مکتبۂ دین و دانش چوک اُردو بازار، لاہور، پاکستان

Thus, if the Quran is to be understood, all these obstacles must be removed, and with reason and knowledge, the Quran must be understood from the Quran itself.

(This article is based on the works of Allama Parwez, Allama Iqbal and Allama Aslam Jairajpuri)

کیا آپ چاہتے ہیں کہ

جو قرآنی فکر اور نظامِ ربوبیّت کی آواز

طلوعِ اسلام

کے ذریعے پھیل رہی ہے (خدا نکردہ) اس کا سلسلہ رُک جائے؟

اگر آپ یہ نہیں چاہتے!

تو رسالہ طلوعِ اسلام خرید کر پڑھیں اور دوسروں کو پڑھنے کی ترغیب دیں!

سالانہ زرِ شرکت مبلغ ۶۰ روپے، بذریعہ چیک یا منی آرڈر، آج ہی ارسال فرمائیں!!

the inherited lore of ancient Syria and Babylonia". But today, to a Muslim all this is Islam !

Another obstacle is the so-called Traditions of Muhammad (PBUH). When properly analyzed it becomes, as H.A.R.Gibb says "obvious that they were forgeries on a large scale. There was no end to fabrication, and legal maxims, Jewish and Christian materials, even aphorisms from Greek philosophy were put into the mouth of Muhammad (PBUH). Religious and political parties showed a suspicious readiness to produce Sayings of Muhammad (PBUH) in the defence of their particular tenets, and as time went on these became more and more categorical and detailed " To quote an interesting and classical example of this: Once Khalifa Haroon stood on the terrace flying pigeons. Beside him stood the Chief Qazi of Baghdad. To please his master he came out with a most injudicious flattery. " This is indeed praiseworthy", he says, " for Muhammad (PBUH) also used to fly pigeons !" And yet when a clash occurs between the Quran and the Traditions, it is the Traditions that supersede the Quran !

Ancestor worship is another hindrance between the Quran and man. Of course the past generations must be applauded for their scientific and cultural achievements, but to say that they aloe could understand the Quran and that the present and future generations must only blindly follow them, is indeed a dangerous attitude and the very negation of the Quranic ideology. It reduces the Quran to historical and local level, when it claims to be universal and eternal.

Last but not the least, Muslim history itself is guilty of keeping man away from the Quran. It has been raised to the status of a deity, and placed on a high and sacred pedestal, so much so, that whenever the Quran and Muslim history come into conflict, it is the Muslim history that gets the upper hand. Whenever a Quranic idea is put forward, it is rejected not because Quran does not sanction it, but because Muslim history does not prove it ! Such is the logic, and it needs no comment.

English proverb aptly conveys, " what cannot be cured must be endured." But the original meaning of it is perseverance on a straight and right path. The two meanings can give a completely different and opposite complexion to the Quranic ideology and the modern meaning of it can influence the whole attitude of mind adversely. Another example is that of مصلّی . Originally it meant "obedience to a ruler", but today it denotes "worship". The change in the meaning strikes the very basis of Quranic ideology - from a social order Islam is reduced to the private affair of the individual. Happily, the original meanings are all preserved in old Arabic poetry, which is to be found in Arabic literature and dictionaries, so there is really no problem in reviving the old meanings and connotations.

It is clear from the above discussions that if the Quran is understood with reason and knowledge, and on the principles laid down by the Quran itself, the Quran promises definite results. But it is a pity that the Quran which was to have direct access to man, has been obstructed by certain later developments. For instance when Syria, Egypt, Persia and India came in contact with the Muslims, and the people of these countries overnight embraced Islam, they were naturally bound to bring along with them their pre-conceived ideas which then infiltrated into Muslim belief, may they be Magi, Jewish, Christian or Hindu. All kinds of institutions like hereditary monarchy, unlimited private ownership, mysticism, order of "darveshes" sainthood, caste system, and ancestor worship etc. became part and parcel of Islam, irrespective of the fact whether the Quran sanctioned them or not. Indeed things came to such a pass that as long as an individual observed the four outward rituals of 'namaz', 'rozah', 'haj' and 'zakat', he could introduce any idea he liked in the fold of Islam. H.A.R.Gibb in his book " Muhammadanism:- A Historical Survey" speaks of it as follows: The preachers he says, " in the form of sermons or commentaries on Quranic text, stuffed the minds of their hearers with materials derived from the vast heterogeneous sources - ancient Arabian legends, Christian, Zoroastrian, and even Buddhist stories, materials from the Gospels and Jewish Haggoda, and all

example is that of مصلّی It is a word used for a horse that is second in the race. It is so close to the first that its nose touches the back of the first, but yet it does not go ahead of it. Dr. Buck, in his "cosmic conscience" states that the German Language which is also rich in concepts has round about fifty of them, but the Arabic Language has over six hundred concepts". A language with so many concepts alone was capable and worthy of being used as a medium of the Quran, the Book that was to be eternal and universal. Hence H.A.R Gibb admits in his " Modern Trends in Islam" that the Quran cannot be translated, for the original meaning cannot be properly conveyed. All that we can do is to convey the meaning by paraphrasing the word, or composing the dictionary of the Quran.

The Quran, however, is revealed in a very simple language. Arabic literature otherwise may be often very high brow and difficult, as the literature of any other language is, but the Quran says of itself, in Surah 26 verse 195. "It is in plain Arabic speech." In another verse 28 of Surah 39 it says" " The Quran is in Arabic containing no crookedness". Yet at another place it says: "And we have made this book easy in thy language". (44/58) Thus it is clear that there should be no difficulty in the understanding of it. The words are plain and simple, they have no hidden spiritual meaning. They need no mystical experience in the understanding of them. They are self-explanatory and accessible to all

But of course, the meaning of the words must be those which prevailed at the time of the Revelation itself. It is a known fact that in the course of time all languages undergo great changes;words no longer express the original meaning, they start representing ideas completely alien to the original text, and conjure images in our minds that are false as far as the original is concerned. For example, if in Shakespeare's plays the word "clerk" meaning "Bishop" when he wrote it, is understood as clerk in its modern meaning, it is apt to change the whole idea that Shakespeare meant to express. In the same way, the Arabic word صبر today means what the following

to study the fall of nations due to disobedience to Allah´s laws. They would not have met this fate, had they not deviated from the permanent, universal laws. The second test is that of studying the Quran on the basis of contemporary knowledge, and finding out as to how it solves the various problems. And thirdly, it suggests that its laws be practised and experimented upon, and then judged from the results that ensue, for the objective of the Quran is to produce results

The pragmatic test thus covers the past, present and future.

The appeal of the Quran is to reason and intellect. In Surah 7 verse 52, the Quran says: "Verily, We have brought them a scripture which we expound with knowledge." Again at another place it says: " We have detailed our revelation for a people who have knowledge and understanding".(6/98-99) Thus the belief of the Quran is based on reason, knowledge and understanding. It is possible that in the beginning there might be a superficial difference of pinion on some minor issues, just as there is among scientists. But after discussion and exchange of views a unity of understanding is arrived at, with the help of the Quran itself, for the Quran claims that there can be no two opinions about the meaning of its verses.

Of course I need hardly point out that alongside with reason and knowledge sincerity of purpose and disinterested search for Truth are also needed.

The next important factor in the understanding of the Quran is the Arabic language, the medium of Revelation. How vast, profound and comprehensive this language is, it can hardly be emphasised. Scholars have realized in their attempt to translate the Quran as to how inadequate other languages are to express the meaning of the Quran. The Arabic words are deeply rich in concepts, that is, the capacity to form a concrete image before the mind´s eye when a particular word is uttered. For example, there is the word ´weak´ or ´feeble´. When spoken in Arabic, it conjures the picture of a new-born baby camel that again and again tries to stand up on its weak and feeble legs. Another

considerth creations of the heavens and the earth, and say: Our Lord ! Thou createdst not this in vain. Glory be to Thee !" (3/191).

Thus the more the scientists consider, the more they will admire His sovereignty and glory.

There are many references to ancient history as well in the Quran. Archaeological discoveries is a field of knowledge that bear concrete and factual witness to the history in the Quran. Thus as knowledge increases, the Quranic Truths are unfolded and as such, the last word on the Quran will have to be left to the last man on earth.

As mentioned above, the various topics are spread all over the Quran, and are not written chapter by chapter. Hence, when one particular subject is under study, all the relevant verses should be first collected together and then studied as a whole. If the system of studying verse by verse is followed, the meaning of the individual verse may become clear but the teaching and education of the Quran does not manifest itself.

Also, there is a fundamental unity in the teachings of the Quran, and so it must be studied as a whole. One verse must not be analyzed separately from the rest of the Quran; it must be seen in its context. For example, if without the conception of the Islamic social order before us it is mentioned that the Quran does not envisage a coinage system, and that the word "ownership" is alien to the Quranic Ideology, or that party system is the very negation of Islamic democracy, it will all sound impossible, because they were mentioned as isolated units. But when the whole Quranic Ideology is before us, these very ideas will most perfectly fit into it. In fact, once the Ideology has been fully understood, then an idea, or even a mere sentence or sub-heading will indicate and reflect the whole system, just as one pure clean dew drop can reflect the whole sun in all its glory.

To its disbelievers, the Quran offers a pragmatic test. One test is that of past history. Man is asked

results this conception has on the development of man´s character and personality. Another injunction is that of the conception of " ownership ". The Quran explains that land has been created for the sustenance of all humankind. Thus man must not own but use land; he must not arrest its growth but leave it open for all humankind; he must not possess, but control land. When man owns land he becomes Allah´s Rival and Shareholder. So far, man has developed the idea of state ownership to replace individual ownership, but time and experience will show that the very word "ownership" is defective.

These examples suffice for the injunctions for human relationship. Reference to the outer universe in the Quran UNFOLD their significance as human knowledge expands and widens. In Surah 41 verse 53, the Quran mentions this very point. "We shall show them our portents on the horizons and within themselves until it will be manifest unto them that it is the Truth". In the following verses references are made to the portents or signs which will be unfolded as science develops. " Have not those who disbelieve", says the Quran in verse 21/30, " Know that the various planets were all of one piece, then we parted them and we made every living thing of water ? Will they not then believe"? At another place, the Quran says "He hath created the heavens and the earth with truth. He maketh night to succeed day, and He maketh day to succeed night and He constraineth the sun and the moon to give service, each running on for an appointed term." (39/5). In another verse the Quran says" "It is not for the sun to overtake the moon, nor doth the night outstrip the day. They float each in an orbit".(36/39). Again in verse 2/164 the Quran says: "Lo! in the creation of the heavens and the earth, and the difference of night and day, and the ships that run upon the sea with that which is of use to men, and the water which Allah sendeth down from the sky, thereby reviving the earth after its death, and dispersing all kinds of beasts therein, and in the ordinance of the winds and the clouds obedient between heaven and earth; are signs of Allah´s sovereignty for people who have sense." In another verse the Quran says: " Such as remember Allah, standing, sitting and reclining, and

Repetition that عبادت means محکومیّت , that is عبادت "serving" another.

Now to come to the next principle of the exegesis of the Quran. It is to be taken into consideration that the Quran consists of two parts: A very small part of it is injunctions for human guidance, given in direct and succinct manner, while the major part deals with Absolute Truths in allegorical style, for these truths cannot be described in any other way. These direct injunctions and the absolute Truths are not to be judged in the context of history. the Quran transcends all space and time, it is universal and eternal. It is therefore applicable to all places and all ages. At no time or space can the Quranic verses stand back and say that they have been exhausted and cannot move any further. A man-made law naturally is local and historical, for it is made in the context of particular historical needs and background,. On the other hand, the Quranic laws and Truths are more and more appreciated as human knowledge and experience increases. The verses regarding the direct injunctions for human guidance when practised, reveal the WHY of these injunctions. For example "Consultation" is laid down as the method for making decisions within fundamental Quranic laws. At the time of Revelation, this injunction is accepted on its face value, but as time passes man is able to appreciate more and more the reason why this injunctions was laid down. Similarly, the idea that "all mankind is one human family, is appreciated better today, for through experience, the evils of geographical, racial and colour divisions have been brought out into bold relief. So far, those injunctions have been mentioned which Man has already been realized to a great extent. One or two more examples will be given below which Man has not yet seen through but will in the future. One of them is that no man has the right to rule over another. Sovereignty cannot lie with an individual, a group of individuals or people as a whole. The characteristics of sovereignty, such as absolute, supreme, indivisible and inalienable cannot be the characteristics of any human organization. The Quran therefore explains that " Allah alone is sovereign". (39/61) One day, man will see its significance, and realize the wonderful

verse 65 of Surah 6: " **See** how we display the Revelation by stating it again and again so that they may understand". As an example of this, you may note that at one place the Quran speaks of the movement of the various planets, the stars the clouds and the various birds and animals, and explains as to how perfectly they move or live according to the universal laws of Nature and maintain complete proportion. Then man is also asked to maintain this proportion in his life. In this example, the lesson was drawn from Nature. At another place, the fact that man should maintain proportion in life, is derived from history. Reference is made to the past nations, who disobeyed Allah's laws and were thus destroyed in spite of their power and splendour and wealth. They had destroyed proportion in their lives, and so they fell.

The verses quoted above are noteworthy for another reason also. In one verse (75/19) the Quran had stated that " Upon Us resteth the explanation thereof". In another verse (6/65) it had said that the revelation is displayed by repeating it". From these two verse it is clear that the verses are explained by repetition. For instance let us take the meaning of the word عابد In one verse the Quran explains that when Moses and Aaron invited Pharaoh to accept the Divine Law, Pharaoh replied scornfully as follows" "should we put faith in two mortals like ourselves, and whose folk are servile unto us?" (23/47) The word for "servile" in the original verse is عابدون . So it is clear here that the word عابد means servile or ruled by another. Continuing the arguments between Moses and Pharaoh, the Quran stated in another verse: " And this is the past favour where with thou reproachest me: that thou hast enslaved the children of Israel ?" (26/22) For the word enslaved again, the original is عبدت . Once again it is obvious that عبد means "servile" or "subordination" to another. In another verse the Quran says: " That ye serve none, save Allah". (11/26). Here again the word تعبد is used for "serve". Yet in another verse (12/40) the Quran says: " The decision rests with Allah only, who hath commanded you that ye serve none save Him".. Here the word حاکم and تعبد have been used which is self explanatory through

The second rule pointed out by the Quran is that it is self-explanatory, and as such describes itself as نورمبین that is, " clear light". In surah 4, verse 175 the Quran says " We have sent down unto you a clear light". Light, as we know, is not only self illuminating, but the surroundings are also illuminated by it. It does not need the aid of another light to illuminate it. The sun, for example, does not depend on a lantern or any electric bulb to make its presence felt. In the same way, the Quran does not need the help of another to make its meaning clear. Its meaning is self-explanatory. Again and again the Quran emphasizes this. At one place it says, " Then Lo ! upon Us rested the explanation thereof". (75/19). At another place it says:" This is a scripture the revelation whereof are perfected and then expounded". (11/1). Thus it is clear that the Quran must be understood from the Quran itself. Just as a rose-bud must be allowed to be opened itself by the process designed by the Creator, or else the petals will fall off if man touched it, in the same way the meaning of the Quran must be opened by its creator by the process designed by Him.

Furthermore, the Quran does not claim to be merely a book of codified laws and injunctions, or a book wherein are collected the formulas for making the wireless set, the railway engine or the sputnik. It is not just a book of information, but something much more than that. Its objective and its method of explanation is that of educating the mind and changing its attitude towards life. Its aim is to bring about a revolution inside the man himself, for after all, the external material civilisation is the expression of the internal spiritual condition of man himself. To serve this purpose therefore, the Quran does not give, like the man-made books, different subjects chapter by chapter. The different subjects are spread out from the beginning of the Book to the end of it. By repetition and from different angles the point is brought home. At one place the Quran mentions a point, at another it defines it, and yet at another place, it first explains it briefly and later in detail. This process is called تصریف آیات , that is, explaining a certain point by repeating it again and again. The Quran says in

understand it as it is, and not on the basis of our own preconceived ideas and according to our own wishes. Quranic laws are not to be judged in the context of man-made laws. They are not to be moulded according to and made subservient to our own likes and dislikes. Quranic laws may be wholly rejected or accepted on their own merit, but if they are to be moulded according to our own wishes, our inclinations and our emotions, then obviously it is no longer the Quran. For example, there is the idea of "ownership". The Quran say that Allah alone is the owner of the land, and those men who own land are assuming to be the rivals of Allah or shareholders in His right to ownership. Now in a man-made social order, "ownership" is its very basis, may its concept be individual or state ownership, so much so, that ownership has come to be looked upon as something very natural and indisputable. Of course, if man does not wish to apply the Quranic idea, he can reject it by all means, but he certainly cannot interpret and twist it to suit his own emotions and his own laws, for then it is no longer the Quranic law. By asking man to approach it without any mental reservation and to judge its laws on their own merit,. the Quran has not asked the impossible. When an individual studies the "Mercantile Theory" or the "Communist Ideology" he judges it on its own merit and accepts or rejects it accordingly. In fact, a human being is naturally expected to do this, he being an intelligent rational being,the characteristics which differentiate him from the lower animals. A man may not wish to approach a book without mental reservations, but that is a different matter. The fact remains, that in the capacity of a rational animal, he can study ideas on their own merit.

Thus the absolute objectivity of the Quran, every word of which is revealed and does not bear even a shadow of man's subjectivity, carries no meaning if it is to be considered subservient to man's wishes. The meaning of the "Kalima", " *La Illah Illillah*" is very significant in this context. The " La" explains the negative aspect, that is, the complete rejection of all pre-conceived ideas, and the word " *Illa*" denotes the acceptance of the Quranic ideas.

PRINCIPLES OF THE EXEGESIS OF THE QURAN
(QURAN *'FAHMI'*)

By

SHAMIM ANWAR

To the layman and to the prospective research scholar of the Quran, different and even paradoxical interpretations is a very baffling and a discouraging factor. Ordinarily, if any book had as many interpretations as there are its readers it would not only be devoid of all greatness, but it would deserve to be thrown in the waste paper basket. And yet, it is taken for granted that the Quran has several and contradictory meanings ! We never stop to think whether this is possible or should be possible, and if it is, whether we should continue to have faith in it. Just imagine the situation if conversation between two people, contract between two business firms, or treaties between two countries could be interpreted in different ways ! There would indeed be utter chaos, disorder and disunity. How can the Quran, that came as a challenge to intellectual confusion, as a solution to all problems, and as a basis of a stable, homogeneous and peaceful social order be subject to contradictory ideas, leading to sectarianism and disunity ? Surely, there must be something wrong somewhere in the approach to the Quran; for the Quran, if it is what it claims to be, cannot have contradictory interpretations.

It is interesting to note that principles of the exegesis of the Quran have been explained by the Quran itself; they have not been left to every individual's discretion for that would have defeated its very purpose. The Quran guarantees that if these principles are faithfully followed, there is no possibility of any confusion in the understanding of it.

The first condition that the Quran puts forward is that it should be approached without any mental reservations. In Verse 79 of Surah 56 it is stated: "None can understand the Quran, save those who have cleared their minds of all pre-conceived ideas". We are thus asked to judge the Quran on its merit, and to